شب خون
273
24/-

جدید نظم و غزل کے معتبر فنکار

معصوم نظر

کا پہلا مجموعۂ کلام

حرف اول

ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے

قیمت : ایک سو پچاس روپئے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

معصوم نظر، شاہد منزل، لال پورہ، ڈونگر پور، ۳۱۴۰۰۱

ایڈورڈ سعید کے خیالات

میری زندگی میں اجنبیت اور بے جوڑپن کے احساسات ہمیشہ موجود رہے ہیں، یعنی یہ کہ میں باہر کا آدمی ہوں۔ لیکن صرف باہری آدمی نہیں، بلکہ میں ایسا آدمی بھی ہوں جس کے لئے، وقت کے گذرنے کے ساتھ، واپس لوٹ کر جانے کے لئے جگہیں کم ہوتی چلی گئی ہیں۔ میں فلسطین واپس نہیں جا سکتا۔ اس کی وجہیں بالکل ظاہر ہیں، اور ان میں زیادہ تر سیاسی ہیں۔ جس مصر میں میرا لڑکپن گذرا، میں اس مصر میں واپس نہیں جا سکتا [یعنی وہاں کے سیاسی حالات بدل گئے ہیں] اور اب میں لبنان بھی واپس نہیں جا سکتا جہاں میری ماں رہتی ہیں اور جہاں کی میری بیوی ہیں۔ میری زندگی کا پس منظر جگہوں کو ترک کرنے اور جگہ سے بے جگہ ہونے کے سلسلوں سے عبارت ہے، ایسے سلسلے جن کے نشانات اور اثرات اب ختم بھی نہیں کئے جا سکتے۔ دو تہذیبوں کے درمیان وجود رکھنے کا احساس مجھ میں شدید، بہت شدید رہا ہے۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سب سے مضبوط دھاگا جو میری زندگی میں رواں رہا ہے، وہ یہی ہے کہ میں چیزوں اور جگہوں میں داخل ہوتا اور پھر نکلتا رہا ہوں۔ میں بہت دیر تک کہیں کا، کسی چیز کا نہیں رہ سکا ہوں۔

میں ادب کا طالب علم اس لئے بنا کہ مجھے ہمیشہ ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی میں ادب کا طالب علم بنا کہ جو چیزیں ادب کے گویا گرد و پیش میں ہیں، جیسے فلسفہ، موسیقی، تاریخ، سیاسیات، اور سماجیات، ان کی وجہ سے ادب کا طالب علم اور بھی کئی انسانی عوامل اور محرکات میں دلچسپی لے سکتا ہے۔

[جہاں تک فلسطین کو واپسی کا امکان ہے تو] میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں واپس جا سکوں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یروشلم کے جس حصے کا میں ہوں، یعنی مغربی حصے کا، تو وہ شروع ہی سے بعد ۱۹۴۸ کے اسرائیل کا ایک حصہ رہا ہے، اور یروشلم کا وہ علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں میں بآسانی مراجعت کر سکوں گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جلاوطنی کا احساس اور اس کا تصور مجھ میں اب اس قدر شدید اور پر قوت ہے کہ میں اس طرح کی کسی مراجعت کے ذریعہ اسے ٹھنڈا یا نرم نہ کر سکوں گا۔

اور بہر حال، میرا تو خیال یہ ہے کہ میں کسی ایسے فلسطین میں یقین نہیں رکھ سکتا ہوں جس کا وجود ہی تقسیم ملک کا مرہون منت ہو۔ میں نے یہ خیال بالکل ترک کر دیا ہے کہ سیاسی مسائل کا حل یہ ہے کہ علاقوں اور خطوں کو چھوٹے، اور پھر اور بھی چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ تقسیم پر میرا اعتقاد نہیں ہے، نہ تو سیاسی سطح پر، نہ انسانی آبادی کی سطح پر، اور نہ ہی کسی بھی قسم کی ذہنی یا روحانی سطح پر۔ یہ سارا تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ قوموں اور معاشروں کے حصے بخرے کئے جائیں۔ برابری کا کوئی بھی تصور، کہ زمین کا فلاں فلاں حصہ فلسطینی یا اسرائیلی وطن کدہ ہے، مجھے بالکل جھوٹا اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ بے شک میں اس بات کے حق میں ہوں کہ لوگوں کو اپنا سیاسی مستقبل خود طے کرنا چاہیے، لہٰذا اگر کوئی معاشرہ یا قوم تقسیم چاہے تو ٹھیک ہے، اسے تقسیم ہونے دیجئے۔ لیکن میں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں اس کارگذاری میں شریک ہوں۔

اگر نارتھراپ فرائی (Northrop Frye) اور دریدا (Jacque Derrida) کا مسئلہ یہ ہے وہ دنیا میں، لوگوں کے درمیان، اپنی زندگیاں یوں گذارتے ہیں کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں انھیں ان کے اپنے ہی خیالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں دنیا میں جہاں بھی جاتا ہوں وہاں مجھے اپنے سیاسی موقف کی غلط تصویر کا سامنا کرنا پڑتا ہے... میں اگر کسی ادبی یا واضح طور پر غیر سیاسی موضوع پر بھی لکچر دینے جاؤں تو بھی ہمیشہ تشدد کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

مجھے جس چیز میں دلچسپی ہے وہ نارتھراپ فرائی (Northrop Frye) کے بیان کردہ ادب سے نہیں ہے، کہ ادب الگ ہی سے ایک مکمل نظام ہے۔ نہیں، مجھے ادب سے دلچسپی اس لئے ہے کہ وہ اور بھی کئی چیزوں سے وابستہ ہے، اور آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وابستگی کے طریقے مسحور کن ہیں... اس بات سے کوئی انکار نہ کرے گا کہ مثلاً کیٹس (Keats) کی ایک اوڈ (Ode) یا والیس اسٹیونس (Wallace Stevens) کی ایک نظم میں ادبی صفات ہیں۔ لیکن کیا وہ ادبی صفات اپنے اندر، اور اپنی حیثیت سے خود مکتفی اور دلچسپ ہیں، اور کسی شخص کے ذاتی لطف اور مسرت کے علاوہ ان میں کچھ نہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ لطف اندوزی شاید اپنی جگہ پر کافی ہو، لیکن اگر ہم ان صفات کے بارے میں بات کرنا چاہیں گے تو ہم ان صفات کو دوسری چیزوں سے مربوط کر کے اپنی لطف اندوزی میں اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۹۸۶ کے ایک انٹرویو سے اقتباسات)

From *Critiasm in Society*, Interviews conducted by Imre Salusinszky

اکتوبر ۲۰۰۳

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین
سرورق : شاداب مسیح الزماں
جلد : ۳۸
شمارہ : ۲۷۳

فون نمبر: 91-532-2622693
کمپوزنگ : ریاض کمپیوٹرز، شارپ ٹریک کمپیوٹرز
ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد- ۲۱۱۰۰۳

E-mail : srfaruqi@sancharnet.in
گذشتہ شمارے کا سرورق: عادل منصوری
خط و کتابت کا پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد- ۲۱۱۰۰۳

فی شمارہ : چوبیس روپے
مطبع :انصاری آفسیٹ، الہ آباد، پربھات آفسیٹ، الہ آباد
کوریئر کے لئے پتہ : 29C, Hastings Road Allahabad-211001

بارہ شمارے : دوسو چالیس روپے
طالب علموں کے لئے سالانہ قیمت : دوسو روپے

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

محمد اظہار الحق

پھر گرد نے لی ہے انگڑائی کوئی آئے گا
پھر دل پر جیسے دھمک پڑی کوئی آئے گا

کوئی آئے گا بادل کی شکل بتاتی ہے
کہتی ہے پرندے کی بولی کوئی آئے گا

کوئی رخصت ہوگا گہری شام کی بارش میں
پھر صبح سے جھانکے گی تتلی کوئی آئے گا

کوئی آئے گا اور سب کچھ بدل کے رکھ دے گا
یہ خلقت بھی، یہ سورج بھی، کوئی آئے گا

کوئی آئے گا اور غربت اطلس پہنے گی
بیچارگی کرنیں اوڑھے گی کوئی آئے گا

جو مٹی پاؤں کے نیچے آتی رہتی ہے
کبھی ہوگی اس کی دادرسی کوئی آئے گا

جو کہیں نہیں وہ آوازیں بھی سنتا ہوں
مجھے دور سے ہے یہ خبر آئی کوئی آئے گا

مجھے دی ہے سنو ترمذ کی خاک نے خوش خبری
مجھے مرو سے کہتی ہے مٹی کوئی آئے گا

مجھے خوشبو آئی ہے انجیر کے پکنے کی
مجھے روکے گیہوں کی مستی کوئی آئے گا

مرے چشمے کا ہے شور عجب کچھ تجھ کو تو
مرے شیشم کی ہے چھاؤں نئی کوئی آئے گا
مرے کیکر لد گئے سونے جیسے پھولوں سے
مرے سپنوں میں سرسوں پھولی کوئی آئے گا
مری چھت سے نیل انگور کی اٹھ اٹھ دیکھتی ہے
مرے توت پہ بیٹھی ہے قمری کوئی آئے گا
مرے شہد کا چھتہ چھلک رہا ہے پھلاہی پر
مرا دودھ امانت مہماں کی کوئی آئے گا
مرے رخساروں پر پھول کھلائے ان دیکھے
مرے ہونٹوں کو دی شیرینی کوئی آئے گا
مری نیندیں قرض کی ہیں واپس ہو جائیں گی
مرے خواب مسافر کی پونجی کوئی آئے گا
مری آنکھیں مند مند جاتی ہیں کوئی بات تو ہے
مرے خون میں کیوں ہے لرزش سی کوئی آئے گا

مرے جگنو گھاس اور شبنم استقبال کریں
مری مٹی یوں ہی نہیں بکھری کوئی آئے گا
مری خوشیوں کا کیا پوچھتے ہو تم دیکھو گے
مری آنکھوں پر اس کی ایڑی کوئی آئے گا
ہر سمت سے وقت رواں ہے میری ہی جانب
دیکھو تو یہ پیغامبری کوئی آئے گا
کہیں دور سے اڑ کر اک غالیچہ آتا ہے
یا شہزادہ یا لال پری کوئی آئے گا
یہ فرغل آنکھیں کات کے میں نے بنایا ہے
پھر اس پر ٹانکی اپنی ہنسی کوئی آئے گا

افق سے ابھرتے ہوئے ستارے

محمد سلیم الرحمٰن

افق سے ابھرتے ہوئے یہ ستارے ہیں آیات اس جاوداں روشنی کی
جو افلاک کی ظلمتوں میں ہمیشہ سفر بھی ہے اور گردشوں کی جزا بھی
منازل جو گرداب کون و مکاں میں کسی لفظ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں
یہ تقدیر کے آئینے جن پہ کب سے جمی ہیں ہر اک راہ رو کی نگاہیں۔

چمک دار موجوں کے کالے ورق پر لکھا لالٹینوں نے اک گنجلک سا
نوشتہ مقدر کا، جیسے کہانت کسی دیوتا کی، اٹل اور ابوجھی
مگر کشتیوں، گودیوں اور تموج کی ہلچل میں فرصت کسے بوجھنے کی
جہازوں پہ ہو ہا، روپہلے دھوئیں کی اڑان اور اونچی کرینوں کی گردش۔

دھوئیں کی طرح فاصلوں اور اندھیروں میں گم ہونے والو،
نئے پن کے پیاسو
تمھارے وطن کی مہکتی شیاروں، پھلوں سے لدی باڑیوں اور بنوں میں
عجب رنگ تھے اور بے نام بوٹے، بچپن اور اپج کے اچھوتے خزانے؛
کھلی زندگی اور شفاف خوشیوں کے سوتے، جو گمبھیر اور دائمی تھے۔

بسیلے کچوکے کی مانند سیٹی فضا میں کھبی اور چمنی سے ابھرا
کبودی ستون اور انجن دہک کر بنے ظلمتوں میں دھڑکتے ہوئے دل۔
دھوئیں، ازدحام اور چیخوں سے مغضوب گودی، کنارے کے چکنے تلاطم
سے پیچھا چھڑا کر کھلے آسماں اور بڑھتے ہوئے امن کی شادمانی۔
یہ سنسان، زخار فرخ جہاں پر دھوئیں کی کدورت، مشینی دہاڑیں
کسی خواب میں دھند اور گونج کے پیکروں کی نری ناتواں کوششیں ہیں۔
یونہی باد و باراں کے گھنگھور موسم کی آٹھوں پہر برملا مار کھاتا
عقب میں سفیدی بلوتا ہوا یہ سفینہ ندا سی مسافت میں گم ہے۔

سیہ رال، زنگ اور برادے سے بدشکل عرشہ، بجھے اور خالی سے چہرے،
بکھرتے ہوئے فاصلوں کے تناؤ میں کھنچتا ہوا آسماں پارہ پارہ
کہ ہر موج، اونچی ابلواں چٹانوں کی مانند، ساقط گرجتا افق ہے۔
سمندر کے افسانوی مرحلوں میں بڑی تشنگی اور تنہائیاں ہیں

اندھیری شفق کے پرستان میں سرنگوں پرچموں کی اداسی؛ دلوں میں
تحیر کہ اس ارغوانی بیاباں کے اس پار نہ جانے کتنے کنارے
ابھی دھوپ سے ہوں گے اجلے مگر ہم مہم اور غربت کا آشوب سہتے،
ٹھٹھرتے دنوں اور دھواں دھار راتوں میں، بے خواب، سب
منزلوں سے پرے ہیں۔

گھنے بن کے سائے میں آباد قریے کے گھر گھر میں روشن ہوئیں
لالٹینیں:
کہیں باغ میں کوئی لیتا ہے تانیں، چمکتے ہیں سنسان سڑکوں پہ جگنو
نکلنے کو ہے چاند ندی کنارے، ہواؤں میں پھولوں کی خوشبو بسی ہے۔
ہمیں خواب میں آج دیکھیں گے کیا اوس اور چاندنی میں وہاں
سونے والے؟

رلاتا ہے دن رات کڑوا دھواں سرخ آنکھوں میں گھٹ کر، ہوا کے
تھپیڑوں
کے ہمراہ موجوں کے اندھے تریڑے برستے ہیں، گرتے ہوں
شہتیر جیسے
سیہ ڈولتے فرش پر پیچ کھاتی ہے کف سے بھری ایک چادر سی ہر دم۔
افق، وسعتیں اور اجالے ہوئے ہیں ہمارے چراغوں کی لو میں مقید
درختوں سے رسنے لگا عنبریں گوند، بن میں کھلے پھول اور مور ناچے
نئے بیل بوٹوں کی رت کا چڑھا چاند، کھیتوں میں سرسوں نے سونا بکھیرا
زمینوں کے سوئے ہوئے رنگ اور حوصلے چیت کی دھوپ
کھا کھا کے جاگے،
چلیں پھر سے پن چکیاں اور نہریں، پتنگیں اڑیں، چہچہائے پرندے۔

اکتوبر ۲۷۳/۲۰۰۳

یہاں ان اندھیروں میں، بدرنگ پرچم تلے، ناشنیدہ کناروں کی جانب
عناصر کے نرغے میں بے دست و پا اک شکستہ سفینہ بہا جا رہا ہے
جھلستی ہوئی دھوپ، حبس اور پیاسی زبانوں کے ڈھنڈار دن جیسے صدیاں
یہ مینہ اور بجلی کے طوفان ایسے کہ پھر عمر بھر جی لگے نہ ٹھکانے۔

کبھی ابر اور دھند کو چیرتی قرمزی صبح نے یادوں کا بہروپ بھر کر
وطن کے مناظر میں، بحری پرندوں کی براق پرواز سے جان ڈالی۔
ہمیں کچھ بجھانے کی نادان کوشش میں جھونکوں کی سرگوشیاں اور آہیں،
نمک کی تہیں فرش پر، دھوپ پھیلی رہی دیر تک۔ دن مندا۔
لالٹینیں۔

نہ جانے ابھی تک یہ حسرت بھری اک خلش سی ہے کیوں دل میں
باقی ہمارے
کہ اپنی اتھاہ اور سرسبز یادوں کو اوروں کے دل کا اجالا بنا دیں۔
وہ بچپن کی باتیں، جوانی کے آدرش، بوباس گھر کی، ہیولے،
دریچے،
تراشیں ان ہیروں کو اس طور کیسے کہ ان کی ابد تک چکاچوند پہنچے؟

گھنے اور پرانے درختوں کی چھاؤں میں قبروں کے آثار شاید ہوں
اب تک؛
وہ چہرے ٹپکتی تھی جن سے جلالت، وہ پرخوف آنکھیں وہ اژدھات بازو،
وہ محبت کے عادی، محبت کے خوگر، وہی لوگ بچپن میں دیکھا تھا جن کو،
وہاں نیند اور خامشی کے ابد میں اکیلے ہیں اور بے خبر سو رہے ہیں۔

کہاں ہیں وہ ارمان اور عزم، اے دل، کہ ہم چھوڑ کر اس پرانے جہاں کو
سمندر کے اس پار جائیں گے، نقشہ بدل دیں گے یکسر زمیں آسماں کا؛
اچھوتی زمینوں سے سونا اگائیں گے، کھوئی ہوئی جنتیں ڈھونڈ لیں گے؟
کہاں اب سفر کی وہ بھینی سی خوشبو، وہ غیبی ندائیں، وہ ہالے، وہ سورج؟

ادھر یہ مہم جس میں آفاق گم ہیں، اندھیرے ہیں یا بیکراں خیرگی ہے
جہاں تازہ دم موت میں جستہ جستہ کسی نت نئی زیست کا ذائقہ ہے،
کہ آخر بنیں گے یہ فانوس اپنے، سفر کے کسی آسماں کے ستارے
امٹ ظلمتوں میں بڑے حوصلوں اور کڑی گردشوں کے نشان اور محور!

وہاں کوئی بھی نہیں تھا

تبسم کاشمیری

وہاں کوئی نہیں تھا
نہ پنچھی نہ ڈھال نہ گھوڑا
کوئی تیرانداز یا شمشیرزن
کوئی داستان گو
یا کوئی مہم جو شہزادہ

وہاں وقت تھا
نہ ساعتیں تھیں
وہاں دن تھا نہ رات تھی
سال، مہینے یا صدی
وہاں کوئی کیلنڈر بھی نہیں تھا

ایک موم بتی تھی جو صدیوں سے جل رہی تھی
رنگ کی ایک محراب تھی
جہاں ہوا چل رہی تھی
اور ایک خیمہ تھا
جہاں کوئی سو رہا تھا
اور ایک خریطہ تھا
جس میں کوئی راز بند تھا

وہاں کوئی بھی نہیں تھا
شاید کوئی بھی نہیں

تبسم کاشمیری

مراجعت کا ایک تجربہ

خیال کے لڑکھڑاتے پہیے ——
—— یاد کا ایک درماندہ سفر
بارشوں میں بھیگتے دن رات
بجلیوں میں چمکتی ہوئی
جامنوں والی ایک سڑک
بوندوں میں جلتی بجھتی لالٹین
اور سرمئی پتھر کی ایک مسجد

پنچھی کا بسیرا
پرانے مسکنوں میں فاختاؤں کے گھر
آم کے پیڑوں میں لٹکتے گھونسلے
اور بچوں کی غلیلوں کا شور

گرما کی یہ تیز پیلی دھوپیں
سرخ اور گلابی کپڑوں سے لدی
—— لمبی لمبی الگنیاں
—— اور ایک گھر
چھتوں پہ ایک گمشدہ بادل
اور اس کی فریاد
چھجوں تلے ایک نابینا

محرابوں پہ کھلتے گلاب
اور ہاتھوں پہ کھلتی چنبیلی
جھاڑیوں میں گلہریوں کے غول
اور دوپہروں کو گرتی چقیں
شاید سب کچھ ویسا ہی ہے ——
—— مگر خیال کے پہیوں کا ضعف
اور یاد کے شیشوں پہ جمتی سیاہی ——
یا پھر میری کہولت
باقی سب کچھ ویسا ہی لگتا ہے

وہاں کوئی ضرور تھا

وہاں کوئی تھا
اس نے میری طرح جھیل میں جال پھینکا
میری طرح ایک تیر چلایا
میری طرح مچھلی کھائی
اور میری ہی طرح ایک چہرے کو پیار کیا

وہ میری طرح دوڑ رہا تھا
میری طرح تیر رہا تھا
اور میری ہی طرح اسپ سواری کر رہا تھا

مجھے یوں لگا کہ وہ میرے جوتے پہن کر چل رہا ہے
میرا پاجامہ پہن کر سو رہا ہے
میرا لباس پہن کر دفتر جا رہا ہے
اور میرا قلم پکڑ کر نظم لکھ رہا ہے

وہاں کوئی تھا
وہاں کوئی ضرور تھا

سید امین اشرف

لرز رہا تھا فلک عرض حال ایسا تھا
شکستگی میں زمیں کا سوال ایسا تھا

کمال ایسا کہ حیرت میں چرخ نیلی فام
شجر اٹھا نہ سکا سر زوال ایسا تھا

کسی وجود کی کوئی رمق نہ ہو جیسے
دراز سلسلۂ ماہ و سال ایسا تھا

کھلا ہوا تھا بدن پر جراحتوں کا چمن
کہ زخم پھیل گیا اندمال ایسا تھا

کبھی یہ تخت سلیماں کبھی صبا رفتار
نشہ چڑھا تو سمند خیال ایسا تھا

گھرے ہوئے تھے جو بادل برس کے تھم بھی گئے
بچھا ہوا تھا جو تاروں کا جال ایسا تھا

کبھی وہ شعلۂ گل تھا کبھی گل شعلہ
مزاج حسن میں کچھ اعتدال ایسا تھا

وہ آنکھیں قہر میں بھی کر گئیں مجھے شاداب
فروغ بادہ میں رنگ جمال ایسا تھا

کسی سے ہاتھ ملانے میں دل نہیں ملتا
طلب میں شائبہ احتمال ایسا تھا

تسلسل پائمالی کا ملے گا
سریر آرا خزاں ہے کیا ملے گا

چلو دشمن کو سینے سے لگالیں
کہاں اس شہر میں اپنا ملے گا

نہیں بے وجہ اس گرداب میں ہوں
کنار آب بھی دریا ملے گا

خرابہ ہے کہ دشت نینوا ہے
کوئی زخمی کوئی پیاسا ملے گا

مرے لشکر کی مٹی دوسری ہے
صف اعدا میں یہ بھی جا ملے گا

نہیں بے سود ناز غم اٹھانا
حباب درد ہے دونا ملے گا

امین اشرف کی ہے پہچان یہ بھی
بھری محفل میں وہ تنہا ملے گا

اسد محمد خاں

ہر کہانی لکھنے والے کے پاس ادھ لکھی ادھوری کہانیاں ہوتی ہیں۔

میرے پاس بھی کئی ادھوری کہانیاں ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کا مجھے خیال رہتا ہے کہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔ کیا خبر اور بھی ہوں، لکی چھپی۔

بعض کہانیاں نوٹس کی صورت میں ہیں۔ کچھ نوٹس کئی صفحوں پر پھیلے ہیں۔ کچھ کم پر۔ بعضے تو بہت ہی مختصر ہیں۔ ایک ڈیڑھ سطر کے ہوں گے۔ ایک جگہ تو صرف پوائنٹس لکھے ہیں: کرائے دار، بیسا کھی والا، مرشد، قتل، ہووپ۔

یہ ٹانگوں سے معذور، اپنے وقت کے مشہور جیب کترے اور نوسر باز ''بمبئی ماشٹر'' کی کہانی کے نوٹس ہیں۔

ان میں 'ہووپ' کا لفظ انوکھا ہے۔ باقی، قتل، بیسا کھیاں، کرائے دار اور مرشد، یہ سب پہچانے ہوئے لفظ ہیں۔ 'ہووپ' ایک طرح کی آواز ہے۔

تو اب دیکھیے ان لفظوں کی مدد سے ماشٹر کو اور اس کی سنائی ہوئی سنسنی خیز کہانیوں کو یاد کرنے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔

بمبئی ماشٹر ہمارے پشتینی مکانوں میں سے ایک بہت چھوٹے مکان میں اپنی بیوی اور سات آٹھ برس کی بیٹی کے ساتھ کرائے سے رہتا تھا۔ وہ ہم لڑکوں اور بعض ہمسایوں کا ایک دم ''ذاتی'' داستان گو تھا۔ اسے کہانیاں سنانے کے ساتھ کہانیاں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔

وہ خود کو بلند آواز میں اسلامی تواریخی ناولیں اور بہرام ڈاکو کی کہانیاں پڑھ کے سنایا کرتا تھا۔ اور جب ناولیں اور کہانیاں نہیں پڑھ رہا ہوتا، اور ہم لوگ مناسب تعداد میں آس پاس موجود ہوتے، تو وہ خود اپنے معرکوں کو بارے میں بتاتا کہ کس طرح اس نے ٹرام میں بیٹھے بیٹھے منٹ بھر میں ایک مارواڑی سیٹھ کی کیش کی تھیلی اڑائی تھی اور کس طرح اس نے اس پیسے سے گوا، اور سری نگر، اور اجمیر شریف میں مزے کیے تھے... اور کس طرح وہ ایک بار درگاہ حاجی علی جانے کے لیے اجتماعی گھوڑا گاڑی میں آگے کوچبان کے پاس جا بیٹھا تھا تو اس نے رستے سے سوار ہونے اور اتر جانے والے ایک سنار کی صندوقچی سے کوئی سیر بھر سونے کے زیورات اڑا لیے تھے... اس مہارت کے ساتھ کہ نہ سنار کو پتہ چلا کہ زیورات جا چکے ہیں اور نہ کوچبان کو معلوم ہوا کہ ماشٹر اس کے وزنی فوجی بوٹ لالہ جی کی صندوقچی میں ڈال چکا ہے۔ اور اب جو لالہ جی کرائے کے دو آنے پکڑا کے سامان اٹھائے خوشی خوشی گھوڑا گاڑی سے اتر رہا ہے تو اصل میں وہ کوچبان کے بوٹ لیے جا رہا ہے، زیورات نہیں۔

ہمیں بہت لطف آتا تھا۔ بڑی کھلبلی ہوتی تھی کہ سنار جب اپنی دکان پہ پہنچے گا اور صندوقچی کا قفل کھولے گا تو اسے وہاں سیر بھر سونے کے بجائے کباڑی بازار سے بارہ آنے میں خریدے گئے فوجی بوٹ ملیں گے۔ مزا آ جائیگا۔

بمبئی ماشٹر اپنی جیب کتری، چوری چکاری اور ٹھگیتی (اور شاید عورت بازی) کی کہانیاں سناتے ہوئے خود کو ایک عجیب منصف مزاج سوشلسٹ اور ایک انوکھے 'صاحب ایمان' مسلمان کی طرح پیش کرتا تھا۔ یہ خوب شوق تھا اس کا۔ اپنی کہانیوں میں وہ کسی غریب ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی مل مزدور، پھیری والے کی جیب نہیں کاٹتا تھا۔ اور کسی ملک التجار، سادہ کار، دھنی دھنوان کو... جو مسلمان ہو... ہرگز نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ اس کا شکار دولت مند ہندو ہوتے تھے اور وہ بھی ایسے جن کے بارے میں اسے معلوم ہوتا تھا کہ سالے ''سود بیاج'' کھاتے ہیں۔ اس کے سوا ماشٹر دین دھرم کا بھید بھاؤ نہیں کرتا تھا۔ نہ!

ہم لڑکوں کی موجودگی میں بمبئی ماشٹر کو اپنی عورت بازی کے بیان سے سرسری سا گذرنا ہوتا تھا۔ تاہم سننے والے ہمسایوں کی آنکھوں کی چمک اور ماشٹر کے رمزیہ انداز میں سر ہلانے سے ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت جو بمبئی ماشٹر اس ہندو عورت کو 'سمجھا بجھا کے' اپنی کھولی میں لے جا رہا ہے تو بے شک اب یہ اس کے ساتھ سوئے گا۔

بمبئی میں زندگی کرنے کے دوران جو مسلمان عورتیں اور لڑکیاں ماشٹر کے راستے میں آتیں، ماشٹر انھیں ٹرام میں بٹھا کے صابو صدیق کی سرائے کے سامنے چھوڑ آتا تھا کہ ''لے اماں''، (یا ''لے بیٹی'') یہ سامنے اپنے مسلمانوں کی سرائے ہے، یہ۔ تب تک کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا تو ادھر رہ سکتی ہے۔

میں ہمیشہ سے یقین کر لینے والا آدمی ہوں۔ ماشٹر کی باتیں (جیسی وہ بیان کر رہا ہوتا) اسی طرح مان لینے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ مگر مجھ سے ایک ڈیڑھ سال چھوٹا میرا بھائی ماشٹر کی اپنی بیان کردہ نیکیوں پر بالکل بھی اعتبار نہیں

کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا... بلکہ یقین تھا اسے... کہ ماشٹر نے مسلمان حاجیوں تک کی جیبیں کاٹی ہوں گی اور موقعہ لگنے پر مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی وہی سب کیا ہوگا جو وہ ہندو عورتوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ ماشٹر جھوٹ بولتا ہے، یا اس نے وہ کیا ہے جسے لوگ کرتے رہتے ہوں گے اور بتاتے نہیں، یا اپنی چوری چکاریاں بیان کرتے ہوئے وہ مسکرائے جاتا ہے... جیسے چوریاں نہ ہوئیں ساہوکاریاں ہوگئیں، جیسے اکھاڑوں میں کشتیاں جیتی ہوں ماشٹر نے۔

مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماشٹر کی کہانیاں مجھے الجھا لیتی تھیں۔ سال بھر پہلے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں آیا تھا اور ہم لڑکے کوئی آٹھ مہینے سے کسی کو بتائے بغیر، چپکے سے جا کے اس کی کہانیاں سن لیتے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو معلوم تھا کہ گھر والوں سے ہمارے آنے کا ذکر بالکل نہیں کرنا ہے۔ کیوں کہ گھر والوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ ہم ماشٹر کے گھر آئیں جائیں یا اس کی کہانیاں سنیں یا محلے والوں کے ساتھ انھیں بیٹھیں۔

ماشٹر بیڑی بناتا تھا۔ اس کی بیوی اجرت پہ گھر سنبھالنے والی 'موگلانی' تھی۔ یہ ماشٹر نے ہمیں بتایا تھا (گھر والے کہتے تھے وہ کہیں پیسے والوں کے وہاں کھانا پکاتی ہے۔)

تو کھانا پکانے میں کیا ہے؟ اگر کسی موگلانی نے پیسے والوں کا کھانا پکا دیا تو کیا ہوگیا؟ کسی کو تو پکانا ہوتا ہے کھانا۔ (اور یہ پیسے والی بات ابھی ہمارے ذہن میں ٹھیک سے نہیں آئی تھی۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ کچھ لوگوں کے پاس پیسے ہوتے ہیں، کچھ کے پاس نہیں ہوتے، یا کم ہوتے ہیں۔ تو اس سے کسی کو کیا؟)

گھر والوں کو یہ بھی کہتے سنا تھا کہ ماشٹر اور اس کی بیوی کچھ گھپلا کر رہے ہیں۔ کوشش کرنے پر بھی ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کیا گھپلا کر رہے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ ہو سکتا ہے گھر والے ماشٹر کو یہاں سے چلتا کر دیں۔ میرے چھوٹے بھائی نے اپنے طور پر کچھ پتہ لگانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی زیادہ صاف نہیں ہو پایا تھا۔ مطلب اسے شک سا تھا کہ ماشٹر کی بیوی کے ساتھ 'دوسرے' لوگ سوتے ہیں۔ بکواس بات تھی! سوتے ہیں؟ ہاہ! کبھی ہو سکتا ہے بھلا؟ ماشٹر 'دوسرے' لوگوں کو چھری نہیں مار دے گا!

خیر۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر ہم لوگوں کو زیادہ کچھ غور کرنے کا شوق نہیں تھا (میرے چھوٹے بھائی کو تھا۔ مگر اس کی بکواسوں پر اکثر میں اسے ڈانٹ دیتا تھا۔)

محلے میں ایک اچھے آدمی امومیاں رہتے تھے (ہم انھیں ٹیڑھی گردن والے اموں میاں ہوپ کہتے تھے)۔ یہ لمبا، بیکار سا نام ہم ہی نے رکھا تھا۔ امو میاں پیری مریدی کرتے تھے۔ ان کی گردن ٹیڑھی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے ہوپ ہوپ کی آواز نکالتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے اپنے موکل کو یا کسی جن کو بلا، یا بھگا رہے ہیں۔ امومیاں نے بمبئی ماشٹر کو بھی مرید بنا لیا تھا۔

ماشٹر اکثر بڑے جذبے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا تھا کہ پیر امومیاں صاب نے بھٹکے ہوئے ماشٹر کو صحی رستے پہ لگا دیا ہے نہیں تو ماشٹر ''جہنمی'' مارا گیا تھا۔

پتہ نہیں وہ خود کو ''جہنمی'' کس بات پہ کہتا تھا؟

باقی کہانی زیادہ کچھ لمبی نہیں ہے۔ ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں تایا کے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ بیس دن بعد لوٹے تو دیکھا کہ ہمارے جس مکان میں ماشٹر رہتا تھا اس میں اب گھاس کا بیوپاری رہتا ہے اور سامنے والے میاں (ٹیڑھی گردن والے امومیاں ہوپ) کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی تو ہمیں پروا نہیں تھی، ہاں، ماشٹر کے جانے سے ہم لوگ بے مزہ ہو گئے تھے کہ وہ سب سنسنی والی کہانیاں اب سننے کو نہیں ملیں گی۔

دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی عجب کہانی لے کے آیا۔ بتانے لگا کہ ماشٹر اصل میں کہیں شفٹ نہیں ہوا ہے، جیل میں ہے۔ اس نے ٹیڑھی گردن والے امومیاں ہوپ کی گردن میں چھری ماری تھی اسی سے امومیاں مرے ہیں۔ بھائی بتانے لگا کہ پہلے پہل تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں دھوبیوں کے لڑکوں نے بتایا کہ رات میں کسی وقت ماشٹر کی بیوی جب امومیاں ہوپ کے لیے میٹھے چاول لے کے گئی تو امومیاں نے اس پہ برے ارادے سے ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چیخنے لگی تو ماشٹر بیساکھیوں کے سہارے اچھلتا ہوا سڑک پار کر کے ہوپ کی بیٹھک میں پہنچا جہاں اس نے وہ سب دیکھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ امومیاں نے کتنی بار ہوپ ہوپ کی، مگر بیوی کی بات ٹھیک تھی تو بس ماشٹر نے ٹیڑھی گردن والے ہوپ کی گردن پہ چھریاں ہی چھریاں ماریں اور اسے ختم کر کے سڑک پہ آکے بیٹھ گیا... اور رونے لگا۔ دھوبیوں کے لڑکے خود حیران ہو رہے تھے کہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ رو کیوں رہا تھا ماشٹر؟ اور امومیاں ہوپ کو اس نے چھریاں کائے کو ماری تھیں؟ لڑکے کہہ رہے تھے کہ ماشٹر خود ہی تو اپنی عورت کو چلاتا تھا، ایک امومیاں کے ہاتھ پکڑنے سے کون طوفان آگیا تھا؟

چھوٹے بھائی نے بتایا کہ دھوبیوں کے لڑکے طوفان کو ''طلوفان'' کہہ رہے تھے۔

جاہل سالے! ☆☆☆

شہریار

تری جدائی میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے
کہیں پہ تو کہیں تجھ سا دکھائی دیتا ہے

زمانہ ہوگیا ایسے کسی سفر میں ہوں
کہ اب نہ موڑ نہ رستہ دکھائی دیتا ہے

الجھ رہی ہے، بہت مجھ سے میرے پاؤں کی گرد
قدم قدم پہ تماشا دکھائی دیتا ہے

عجیب وقت سنو! آپڑا ہے سورج پر
طلوع ہوتا نہ ڈھلتا دکھائی دیتا ہے

یہ میری آنکھیں نہیں دوسروں کی آنکھیں ہیں
اندھیرا ہے یہ اجالا دکھائی دیتا ہے

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

اے جنوں تجھ سے تقاضا ہے یہی دل کا مرے
شہر امید کے نقشے کو بدلتا دیکھوں

یہ سفر وہ ہے کہ رکنے کا مقام اس میں نہیں
میں جو تھک جاؤں تو پرچھائیں کو چلتا دیکھوں

چاہے تاریکی مخالف ہو، ہوا دشمن ہو
مشعل درد کو ہر حال میں جلتا دیکھوں

وصل آثار کوئی لمحہ میسر آئے
ہجر کی ساعت بے مہر کو ٹلتا دیکھوں

غزل

محمور سعیدی

جاگتی آنکھوں کے جن خوابوں کو جھٹلاتا ہے وقت
گاہے گاہے ان کی خود تعبیر بن جاتا ہے وقت

کونپلوں کو دھوپ کے شعلوں میں جھلساتا ہے وقت
اور جھلسے پیڑ پر شبنم بھی برساتا ہے وقت

دور ہی سے کھیلتا ہنستا گذر جاتا ہے وقت
ہم فقیروں کے قریب آنے سے کتراتا ہے وقت

پھر کسی خوابیدہ فتنے کو جگا جاتا ہے وقت
شورش شام و سحر میں جب کمی پاتا ہے وقت

وقت ہی صبح مسرت وقت ہی شام الم
نت نئے بہروپ بھر کر سامنے آتا ہے وقت

بستیاں خود ہی بساتا ہے مگر پھر ایک دن
بستیوں کو روند کر آگے چلا جاتا ہے وقت

غم کی دیواریں اٹھاتا ہے کہ سر پھوڑے کوئی
اور پھر خود ہی یہ دیواریں گرا جاتا ہے وقت

بھول جاتا ہوں کہ سورج بن کے برسایا تھا قہر
چاند بن کر جب مری چھت پر اتر آتا ہے وقت

ٹوٹ جانا اور بکھر جانا دلوں کا دفعتاً
آبگینے ہیں جنھیں پتھر سے ٹکراتا ہے وقت

ساعتوں کے یہ کھلونے ہیں مرے کس کام کے؟
ایک بچے کی طرح کیوں مجھ کو بہلاتا ہے وقت

لے کے آجاتا ہے گذرے واقعوں کو سامنے
کچھ پرانے روز و شب ہیں جن کو دہراتا ہے وقت

ہر نفس اک معجزہ ہے جینے والوں کے لئے
کون سمجھے گا یہاں کس کو یہ سمجھاتا ہے وقت

دو گھڑی رک کر کہیں ہم خود سے مل سکتے نہیں
عمر بھر ان راستوں پر ہم کو بھٹکاتا ہے وقت

اس طرف سے پھر کوئی رستہ کہیں جاتا نہیں
زندگی کو دھیرے دھیرے جس طرف لاتا ہے وقت

وقت کی آہٹ سے اے مخمور گھبراتے ہیں سب
میکدے کی راہ سے گذرے تو گھبراتا ہے وقت

غزلیں

عبدالاحد ساز

میں نے اپنی روح کو اپنے تن سے الگ کر رکھا ہے
یوں نہیں جیسے جسم کو پیراہن سے الگ کر رکھا ہے

مرے لفظوں سے گذرو، مجھ سے در گذرو کہ میں نے
فن کے پیرائے میں خود کو فن سے الگ کر رکھا ہے

فاتحہ پڑھ کر ہمیں سبک ہولیں احباب، چلو ورنہ
میں نے اپنی میت کو مدفن سے الگ کر رکھا ہے

گھر والے مجھے گھر میں دیکھ کے خوش ہیں وہ یہ کیا جانیں
میں نے اپنا گھر اپنے مسکن سے الگ کر رکھا ہے

عمر کا رستہ اور کوئی ہے، وقت کے منظر اور کہیں
میں نے بھی دونوں کو ہم بچپن سے الگ کر رکھا ہے

اس پہ نہ جاؤ کیسے کیا ہے میں نے خود کو خود سے الگ
بس یہ دیکھو کیسے انوکھے پن سے الگ کر رکھا ہے

درد کی گتھی سلجھانے پھر کیوں آئے ہو خرد والو
بابا ہم نے تم کو جس الجھن سے الگ کر رکھا ہے؟

اب مسرت روح پر چھاتی نہیں
آتش غم دل کو پگھلاتی نہیں

ایک سی ظلمت، کہ ظلمت کیا کہیں
روشنی ضد جس کی کہلاتی نہیں

شور نے یوں کر دیا ہے بے مزاج
خامشی سی شے پسند آتی نہیں

یہ تعطل، یہ گھٹن، یہ بے بسی
اور یہ کہ روح گھبراتی نہیں

یہ محلے... اپنے بچپن کے کھنڈر
جن سے اب کوئی صدا آتی نہیں

گھل کے مر جائے نہ قید جاں میں ذات
کب سے کچھ پیتی نہیں کھاتی نہیں

چھیڑ دے دم بھر کوئی ساز اجل
زندگی کی کوئی لے بھاتی نہیں

امجد اسلام امجد

آیتین (۱) کے لئے ایک نظم

ابھی تو اتنی نازک اور چھوٹی ہے وہ
کہ اسے اٹھاتے ڈر لگتا ہے۔
اس کے لبوں پر کھلنے والی
پیاری سی مسکان ہے ایسی
جس میں آدم زاد منصب کی رفعت کی
ضو ملتی ہے
اس کے ننھے ہاتھ کے لمس میں جو ملتی ہے
اس راحت کو اب لفظوں میں لاؤں کیسے

ایسی زندہ کیفیت کو ظاہر کرنے والی زبانیں
ابھی کہاں بن پائی ہیں
میرے بلانے پر وہ مجھ کو ایسی نظروں سے تکتی ہے
یوں لگتا ہے جیسے اس کو ساری بات سمجھ آتی ہے

مولا، جیسے اس بچی کا نام ہے آیتین
اس کی ہنسی میں روشن رکھنا سارے گھر کا چین

طاقت

طاقت ہی اک زبان ہے، جس کا کوئی بھی لفظ
مہمل نہیں، غریب نہیں، بے اثر نہیں
روز ازل سے آج تلک اس کے فیصلے
دانش کی ہر دلیل پہ حاوی رہے ہیں اور
اس کے لکھے کو کوئی قلم زد نہ کر سکا

ماضی میں اور آج میں بس اتنا فرق ہے
پہلے جو زور آور تھے وہ سب اپنے فیصلے
لکھتے تھے نوک تیغ اور بہتے لہو کے ساتھ
اور آج کے جو جابر و عالم پناہ ہیں
ان کے لبوں پہ رہتی ہے روشن سدا ہنسی
ریشم سے ان کے لفظ ہیں، خوشبو سی گفتگو
مطلوب کوئی فرد ہو یا قوم ہو کوئی
جینے کا حق یہ چھینتے ہیں، اور اس ادا کے ساتھ
جیسے جہاں میں عدل کی حرمت اسی سے ہو
جب چاہیں ختم کر دیں یہ نقشے سے وقت کے
پل بھر میں جیتی جاگتی بستی کا ہر نشاں
اپنے وطن میں اپنے ہی گھر میں نہ رہ سکیں
ہیں لوگ ان کے واسطے کاغذ کی کشتیاں
اگلے دنوں میں کرتے تھے تیغ و تبر سے قتل
یہ پھونکتے ہیں آگ میں آباد بستیاں

دانشوری اور عدل کا چرچا ہے ہر طرف
ظالم کا ظلم روکنے والا کوئی نہیں
تاروں کا راز داں ہوا انسان کا دماغ
قاتل کو اب بھی ٹوکنے والا کوئی نہیں

---

(۱) نواسی، تحسین اور ناصر کی بیٹی۔

غزل

توصیف تبسم

ٹھہر گیا ہے سر آئینہ مرا پرتو
یہ سوچ کر کہ یہاں کوئی بھی نہ رہتا ہو

وہ آفتاب ابھی تک مرے لہو میں ہے
چلا ہے ڈھونڈنے جس کو ستارہ ٔ شب رو

زمیں کے پھول لب و رخ کے استعارے ہیں
عجیب سیر ہے گھر سے نکل کے دیکھو تو

کنار آب سفینہ ہے منتظر کوئی
جو ہو سکے تو اسی لہر کو کنارہ کرو

پس مژہ کئی مہتاب جھلملاتے ہیں
کچھ اور دور اسی روشنی میں ساتھ چلو

اگر ہے زندہ تو ہونے کا کچھ جواز تو دے
جو کامگار نہیں ہے تو نقش عبرت ہو

حیات ڈوب چکی درد کی سیاہی میں
اب ایک رنگ ہے تصویر ہو کہ پردہ ہو

ابھی یہ روشنیاں تیز ہو کے گل ہوں گی
ابھی تو وسط تماشا ہے دیکھتے جاؤ

سمجھتی ہے اسے موج رواں ہنر اپنا
تراشتا ہے کوئی اور سنگ دریا کو

غزل

غلام حسین ساجد

بہار خوش ادا کے سبز پھیرے میں
بہت دن ہیں ابھی موسم بدلنے میں
کسی کوئل نے دیپک راگ گایا ہے
دیئے جلنے لگے ہیں پتے پتے میں
بہت دیکھنے کو ہے ابھی باقی
کبھی آیا نہیں میں اس علاقے میں
اسے بھی قوت بازو سے پایا ہے
زمیں آئی نہیں تھی میرے حصے میں
رہے گی وصل کے امکان تک روشن
بھڑکتی ہے جو مشعل میرے سینے میں
کبھی آنکھوں میں اس سیمیں بدن کی تھی
چھپی ہے آج جو تنویر تارے میں
ابھی سے فکر کیوں رہنے لگی دل کو
بہت سا وقت باقی ہے بچھڑنے میں
مجھے اپنی جھلک دیتے چلے جاؤ
اندھیرے میں کبھی آکر اجالے میں
ازل کے دن سے وہ شامل رہا ساجد
کسی صورت مرے ہونے نہ ہونے میں

غزل

توصیف تبسم

تھکن زیادہ ہے کیوں جب سفر زیادہ نہیں
جنھیں خبر ہے انھیں بھی خبر زیادہ نہیں
وہ راستے وہ مسافر سراب خواب تھے کیا
کھلی جو آنکھ تو دیکھا شجر زیادہ نہیں
ملال جی کا گذرتی ہوا سے کیا کہنا
ملول ہوں کہ مرے نامہ بر زیادہ نہیں
کلی کھلی ہے مگر کس قدر تکلف سے
ہوائے موسم گل رنج بر زیادہ نہیں
غمیں نہ ہو کہ ترے حال زار پہ وہ نظر
کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے، اگر زیادہ نہیں
ہوا کے بین تھے غرقاب ساحلوں کے قریب
ہوا وہی ہے مگر نوحہ گر زیادہ نہیں
خیال وسعت ہفت آسماں کو چھان چکا
بقدر وہم مرے دشت و در زیادہ نہیں

غزلیں

غلام حسین ساجد

نہ ہوگی اور کسی چیز کی طلب اس کو
چراغ ساتھ لئے پھر رہے ہیں جب اس کو

زباں کے ساتھ ہیں محو کلام آنکھیں بھی
بالآخر آ ہی گیا دل لگی کا ڈھب اس کو

کسی کے دل میں مہکتا ہے وہ گلاب اب تک؟
کہ میری طرح بھلائے ہوئے ہیں سب اس کو

کبھی کسی کے مقابل نہیں جو آپایا
کیا ہے میں نے بہر طور منتخب اس کو

کبھی تو آئے گا اس گل بدن کو دھیان مرا
کبھی تو راہ پہ لائے گا میرا رب اس کو

ہے اس کے دل میں اترنے کی آرزو اب بھی
نہیں کہ مجھ سے شکایت ہے بے سبب اس کو

شروع مجھ سے ہوئی رسم عاشقی ساجد
کہ مجھ سے پہلے کوئی چاہتا تھا کب اس کو

محبت ٹوٹ کر جس سے کبھی کی تھی اسی سے جنگ کی ہے
بہر صورت زمیں ہم نے بہت اک دوسرے پر تنگ کی ہے

بہت سے راز ہیں جن کا بیاں کرنا بہت آساں رہے گا
مجھے پروا مگر کچھ چاہنے والوں کے نام و ننگ کی ہے

بجا ہے گر کسی کو زعم ہے اپنی صباحت کا، اگر چہ
پس آئینہ جتنی روشنی ہے سب چراغ زنگ کی ہے

پشیماں اپنی حالت پر وہیں چھوڑا تھا دنیا کو کسی دن
کہ یہ شے ہم نے اپنے ساتھ رکھی ہے نہ اس کے سنگ کی ہے

نظر اصل حقیقت پر نہیں پڑتی ہے میری بھول کر بھی
کہ اک چادر ابھی تک میری آنکھوں پر طلسمی رنگ کی ہے

کبھی الزام کوئی آئینے پر اور فطرت پر نہ دیں گے
وہ کہتے ہیں مری دنیا کسی رنگیں ادا نے دنگ کی ہے

سریلی گھنٹیاں بجتی سنائی دے رہی ہیں آج ساجد
صدا میرے تعاقب میں ابھی تک اس پری کے چنگ کی ہے

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

پار اتار کر مجھے ناؤ کو ڈبو گیا
واپسی کا راستہ غرق آب ہوگیا

بحر فرط جوش میں ہم کنار ہوگیا
اپنے اک ابال سے لب مرے بھگو گیا

میں نہیں سمجھ سکا کون سازیاں ہے یہ
جو کبھی ملا نہیں رنج ہے کہ کھو گیا

کھوٹ کچھ لگا مجھے اس کے ہر خلوص میں
آڑ میں وہ پھول کی خار سا چبھو گیا

نیند جب سوار ہو وقت کیا مقام کیا
چلتے چلتے میں کہیں راستے میں سو گیا

خار وخس کی ذات کا علم تھا اسے ضرور
کاٹنا محال ہے ایسی فصل بو گیا

سر جھکا کے راہ میں بیٹھنے سے یہ ہوا
ناتواں سمجھ کے وہ بوجھ میرا ڈھو گیا

کہیں بھی سانس لیں ہم ہوا ہر جا بہم ہے
نہ پوچھو اس کی قیمت جو بے دام و درم ہے

انی برچھی کی اس کی مری نوک قلم ہے
اتر جائے جو دل میں وہی ان میں اہم ہے

جو رکھا تھا زمیں پر مرا پہلا قدم تھا
پڑا ہے چاند پر جو مرا اگلا قدم ہے

ملے تلوؤں کو ٹھنڈک جلن آنکھوں کی کم ہو
چلیں ہم پا برہنہ جہاں تک گھاس نم ہے

خوشی سے بیچ دیں گے جگر کیا جان اپنی
بہت ایسے ملیں گے جنھیں جینے کا غم ہے

سخی کا لیکھا جو کھا جو رکھتا ہے وہ جانے
مدد میں دس لکھا ہے صلے میں سو رقم ہے

مرے ہر پل کی اس کو خبر رہتی ہے راہی
اگرچہ اس کی جانب توجہ میری کم ہے

غزل

غلام مرتضٰی راہی

وہ راہ جو پر خطر نہیں ہے
اس میں بھی مرا گذر نہیں ہے
ہے ناز تمھیں کس آگہی پر
ہمسائے کی جب خبر نہیں ہے
سب راکھ ہوا بس اب کوئی دم
اک آنچ کی بھی کسر نہیں ہے
آتا ہے خیال چلتے چلتے
میرا کوئی ہم سفر نہیں ہے
اب جا کے ہوئے ہیں تہ نشیں ہم
دریا میں جب گہر نہیں ہے
ترتیب سے حسن ہے جہاں کا
اک چیز ادھر ادھر نہیں ہے
رکھتے تھے توقعات جس سے
اس نوع کا یہ بشر نہیں ہے

کیا بات ہے جو گلی میں اس کی
اے خاک ترا گذر نہیں ہے
بھایا نہ ہمیں بھرا پرا شہر
خالی یہاں کوئی گھر نہیں ہے
رکھے وہ لحاظ فاصلے کا
کمزور مری نظر نہیں ہے
اے بحر بے کنار، تیری
اک بوند میں بھی اثر نہیں ہے
اک دار پہ ہے تو ایک در پر
کاندھے پہ کسی کا سر نہیں ہے
اب دور نکل چکا ہے اتنا
بندے کو خدا کا ڈر نہیں ہے
وہ شہر ہے فتح پور جس میں
راہی تو ہے رہگذر نہیں ہے

غزل

کرشن کمار طور

ہے دونوں آنکھوں کا شاید نشانہ ایک طرف
جو میں ہوں ایک طرف تو زمانہ ایک طرف

یہی بہت ہے وفا کی دہائی دیتے رہو
جو ہونے والا تھا آخر ہوا نہ ایک طرف

میں اپنے آپ گھلا جا رہا ہوں اندر سے
گراں ہے گردش رسم شبانہ ایک طرف

کوئی جہاں میں خریدار ہی نہیں اس کا
ہے بیش قیمتی غم کا خزانہ ایک طرف

میں خلق کرتا ہوں خود کو یہاں کہیں نہ کہیں
سلوک دہر ہے کچھ غائبانہ ایک طرف

یہ وہ دیا ہے جو دن میں بھی جلتا رہتا ہے
ہے شام ہی سے غم کربلانہ ایک طرف

کہیں بھی جاؤں ہے ہجرت مرے مقدر میں
میں ہر علاقے سے ہوں اب روانہ ایک طرف

تمھارے عشق میں کیسا یہ مخمصہ ہے طور
انانہ دونوں ہی جانب انانہ ایک طرف

رشید امجد

گھر سے باہر رہنے کا تصور اتنا ہی تھا کہ صبح جا کر شام کو واپس آ جانا۔ رات گھر سے باہر گذارنے کے خیال ہی سے ہول اٹھتا۔ رات گھر سے باہر رہنے میں اور تو کوئی قباحت نہ تھی، بس یہ تھا کہ وہ رات کو اکیلا نہیں سو سکتا تھا۔ دوست احباب اس کی بات سن کر ہنستے تھے، لیکن وہ اکیلا سونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے ایسے ڈراؤنے خواب آتے، کبھی لگتا کوئی اس کے سینے پر سوار ہو گیا ہے۔ کروٹ بدلتا تو وہ نادیدہ وجود اس کے کندھوں پر بیٹھ جاتا، اس کی چیخ بھی نہ نکلتی، محسوس ہوتا کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ کوئی شیر خوار بچہ بھی پاس لیٹا ہو تو یہ سارے خوف دور ہو جاتے اور وہ مزے سے سویا رہتا۔ اب معلوم نہیں یہ خوف کیسے اس کے وجود میں در آیا تھا، بہر حال اب تو موجود تھا، اور ایک زندہ حقیقت۔

کہیں شہر سے باہر جانا ہوتا تو وہ اس طرح پروگرام بناتا کہ شام ہونے سے پہلے لوٹ آئے، اور اگر کبھی رات باہر رہنا ہی پڑ جاتا تو وہ کسی ایسے ریستوراں کا انتخاب کرتا جو ساری رات کھلا رہتا۔ وہ چائے پیتا رہتا، رات دبے پاؤں گذرتی رہتی۔ صبح کی پہلی کرن دروازوں پر دستک دیتی تو وہ اطمینان کا سانس لیتا۔ دفتری مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھی اسے دو دو راتیں اسی طرح گذارنا پڑتیں، سو اکثر شہروں میں اسے اس طرح کے ریستورانوں کا علم تھا جو ساری رات کھلے رہتے ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب تجربہ تھا۔ عام طور پر ایسی جگہوں پر شفٹوں میں کام کرنے والے کھانا کھانے یا چائے پینے آتے۔ کچھ لوگ گھر جانے سے پہلے آنا ضروری سمجھتے۔ ادیبوں شاعروں کی ایک جماعت بھی مستقل موجود ہوتی، اخباروں میں کام کرنے والے بھی ایسے ریستورانوں میں دیر تک بیٹھتے، لیکن ایک وقت ایسا آتا کہ بیرے اور وہ ہی باقی رہ جاتے۔ ان کی تند و تیز نظروں سے بچنے کے لئے وہ وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ منگاتا رہتا، کچھ کھاتا، کچھ چکھتا اور کچھ چپکے سے نیچے پڑی ٹوکری میں پھینک دیتا، بہر حال رات کسی نہ کسی طور گذر ہی جاتی۔

بیوی اس کے خوف سے واقف تھی اس لئے وہ کبھی میکے میں رات نہ گذارتی۔ شروع شروع میں البتہ کچھ تلخی پیدا ہوئی لیکن ایک دن اس نے بیوی کو ساری بات بتا دی۔ پہلے تو وہ ہنس پڑی لیکن اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر متفکر ہو گئی اور بولی۔ ''اس کی کچھ تو نفسیاتی وجہ ہو گی، تم کسی اچھے ماہر نفسیات سے کیوں نہیں مل لیتے؟''

وہ چپ رہا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ یہ خوف اس کی ذات کا حصہ ہے اور ذات کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ خود اس نے اپنے طور پر کئی توجیہات کی تھیں، مگر بے سود۔ خوف تو اپنی جگہ تھا، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی تو کہیں نہیں جاتی۔ چنانچہ آسان طریقہ یہی تھا کہ باہر جانے کے مواقع ٹال جاتا، حالانکہ اس سے خاصا مالی نقصان بھی ہوتا۔ اس کے دوسرے ساتھی ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے کہ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ اے۔ ملنے کی کوئی صورت بنے۔ اس کے افسر بھی اب اس کی عادت سے واقف ہو گئے تھے اور اکثر اسے باہر بھیجنے سے گریز ہی کرتے تھے، لیکن اس بار دورے کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے جانا پڑا۔

خیال تھا کہ حسب معمول رات کسی ریستوراں میں گذر جائے گی۔ بیٹھک کی جگہ شہر سے باہر تھی، اور خاصی دور، اس کے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔ بیٹھک شام تک چلتی رہی۔ اس نے چاہا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے شہر جا پہنچے مگر معلوم ہوا کہ اس وقت شہر جانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اس کے لئے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ محفوظ تھا۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے مگر سب بے کار۔ مرتا کیا نہ کرتا، کھانا کھا کر اسے کمرے میں جانا پڑا۔ کمرہ آسائش دار اور آرام دہ تھا۔ ایک دروازہ باہر کی طرف، دوسرا ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس طرف کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔

اس نے خود کو تسلی دی اور ٹی۔ وی۔ آن کر دیا۔ پروگرام دلچسپ تھے، وقت گذرنے کا احساس نہ ہوا۔ لیکن ایک بجے کے قریب نشریات ختم ہو گئیں۔ اس نے ادھر ادھر چینل تلاش کئے، مگر یہاں کیبل یا ڈش تو تھی نہیں، اسکرین پر کچھ نہ ابھرا۔ بس ایک سائیں سائیں کی آواز نے اس کے وجود پر دستک دی۔ ایسے میں سونے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز ہو کر دیواروں کو گھورنے لگا۔ ان کی سفیدی میں سے شاید ایک خوفناک ہیولیٰ ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتہً اسے خیال آیا کہ پلنگ کے نیچے کوئی چیز سرسرا رہی ہے۔ وہ اچھل کر نیچے اترا۔ جھانکا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے ساری بتیاں روشن کر دیں، لمحہ بھر کے لئے کمرہ جگمگا اٹھا تو اس نے خود کو تسلی دی۔ لیکن یہ صرف ایک لمحہ تھا، اس کے فوراً بعد اسی جگمگاتی روشنی میں سے کسی ان دیکھے وجود کے ابھرنے کا احساس ہونے لگا۔ خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے چیخ نکلتی، ساتھ والے کمرے کی طرف کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا... دستک جاری رہی۔ اس نے دیکھا کہ ادھر کنڈی لگی ہوئی ہے۔ بادل نا

خواستہ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے ایک نوجوان مرد اور اسی عمر کی ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، نوجوان بولا۔

'' آپ نے برا تو نہیں منایا؟ دراصل ہم لوگ بور ہو رہے تھے، سوچا آپ سے گپ شپ لگائی جائے۔''

اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر کیا، اور فوراً بولا۔ ''نہیں نہیں، میں تو خود بور ہو رہا تھا۔ آیئے آپ لوگ اندر آیئے نہ۔'' وہ ایک طرف ہو گیا۔

'' یہ میری بیوی ریحانہ ہے اور میں قدوس ہوں۔'' نوجوان اندر آتے ہوئے بولا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے، وہ بستر کی پائنتی پر ٹک گیا۔

'' آپ آرام سے لیٹے رہئے، کچھ تکلف نہ کیجئے۔'' ریحانہ بولی۔

وہ نیم دراز ہو گیا۔

مجھے تو اکیلے میں بڑا ڈر لگتا ہے'' قدوس کہنے لگا۔

'' یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!'' خوشی کے مارے اس کے منہ سے لفظ نہ نکل رہے تھے۔

باتیں شروع ہو گئیں، دنیا بھر کی باتیں، گھروں کی، دفتروں کی دوستوں کی... معلوم نہیں کب وہ اونگھ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ ہشاش بشاش تھا۔ مہمان دونوں کب کے جا چکے تھے
'' شاید میں سو گیا اور وہ چپکے سے چلے گئے۔ بڑے شریف لوگ تھے۔''

ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرتے ہوئے اس کے میزبان نے پوچھا۔

'' رات تو آرام سے گذری؟'' پھر ہنستے ہوئے وہ بولا، '' ڈر تو نہیں لگا آپ کو، کیوں؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' اس نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔ '' پڑوس والے کمرے سے قدوس صاحب اور ان کی بیگم آ گئے تھے۔''

میزبان نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ '' ساتھ والے کمرے سے؟''

'' جی ہاں، ساتھ والے کمرے سے، بڑے اچھے ہیں دونوں میاں بیوی۔''

میزبان لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا۔

''لیکن... لیکن ساتھ والا کمرہ تو خالی ہے۔''

'' خالی ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ '' لیکن قدوس صاحب اور ان کی بیوی تو...''

'' گذشتہ سال وہ دونوں اسی کمرے تھے۔'' وہ کچھ رکتا ہوا بولا۔ رات کو گیس کا ہیٹر کھلا رہ گیا تھا، بے چارے دونوں...'' میزبان چپ ہو گیا۔

لمحہ بھر تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آیا، جھپٹ کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔

ساتھ والے کمرے میں جانے والے دروازے کی کنڈی اندر کی طرف لگی ہوئی تھی ☆☆☆

پرتپال سنگھ بیتاب

گفتار سے آگے کہیں کردار سے آگے
اک شخص ہے، مجھ میں مرے افکار سے آگے
یہ جستجوے لوح و قلم اس کے لئے ہے
وہ شے کہ بہت ہے مرے اشعار سے آگے
جاگیر مری دور تلک پھیلی ہوئی ہے
میں دیکھ رہا ہوں فقط آثار سے آگے
دریا تو ہے اک مرحلۂ شوق وگرنہ
مقصود سفر ہے کہیں اس پار سے آگے
دیوار میں دروازہ اچانک نکل آیا
سایہ سا کوئی تھا حد اسرار سے آگے
اک سوچ کہ تفہیم کی منزل سے پرے اور
اک طرز تکلم لب اظہار سے آگے
یہ آبلہ پائی تو مرا عزم سفر ہے
جانا ہے مجھے وادی پرخار سے آگے
میں خول سے باہر جو نکل آیا تو دیکھا
کچھ اور بھی دنیا مرے پندار سے آگے
اس دھوپ میں سایہ مجھے درکار تھا بیتاب
پھر کیا ہوا میں چل دیا دیوار سے آگے

بت کدوں سے بتوں سے آگے ہے
وہ بھی سرحدوں سے آگے ہے
وہ برستا ہے بر زمین غیب
اور ان بادلوں سے آگے ہے
اے صبا وہ بہار ہے نہ خزاں
ان سبھی موسموں سے آگے ہے
ایک پرواز ہے مگر شاہین
وہ تمھارے پروں سے آگے ہے
عشق بھی ایک زاویہ ہے مگر
جسم کے زاویوں سے آگے ہے
راہ کے یہ فریب ہیں سارے
شوق ان منزلوں سے آگے ہے
اک صنوبر ہے میری یادوں میں
کہیں ان جنگلوں سے آگے ہے
وہ اکیلا سفر میں ہے بیتاب
مگر ان قافلوں سے آگے ہے

نظمیں

شاہین

نوحہ

ہم وطن میرا
نہ ہم سایہ نہ ہم رشتہ
نہ ہم عصر نہ دوست
وہ مرا کوئی نہ تھا
کس تعلق کی بنا پر میں اسے یاد کروں
سوگ میں نظم لکھوں بھی تو میں کس طور لکھوں

میں تو یہ جانتا ہوں
میں نے جو کچھ بھی کہا میری ہی آواز ہے وہ
جس کی ہر لہر میں جذبے کی صداقت ہے وہی
میری اور اس کی کہن سال رفاقت ہے وہی

وہ کہ زندہ ہے
مذاق اے غم دل کیسے اڑاؤں اس کا
اور سب لوگ جو کہتے ہیں
وہ سچ ہو بھی تو جی چاہتا ہے
اس کے مرنے پہ سہی جشن مناؤں اس کا

غزہ ۲۰۰۳

امریکی لڑکی ریچل کوری (Rachel Cory) کی یاد میں جس نے ۲۸ فروری ۲۰۰۳ کو غزہ سے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا کہ میں بڑی حد تک تقویت محسوس کرتی ہوں اور یہ کہ سخت سنگین حالات میں بھی انسان اپنی انسانیت سے دست بردار نہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دو ہفتے بعد ۱۶ مارچ کو ایک فلسطینی گھر کو اسرائیلی جارحیت پسندوں سے بچانے کی کوشش میں وہ ایک بلڈوزر کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئی۔

ساری دنیا دیکھتی ہے
اک تماشائی کی صورت
ہونے دیتی ہے یہاں جو ہو رہا ہے
بربریت اور تشدد، سینہ زوری اور چھل
سبزیوں کے کھیت اور باغات میں
اینڈتے، اٹھلاتے بلڈوزر کے دل
زندہ رہنے سے جڑے
کس بل پہ اک ضرب مسلسل
ہر طرف سے
نسل کش نرغے میں آئے مرد و زن، طفل و جواں
آج ہے محفوظ جن کا اور نہ کل
پھر بھی اک ایقان، اک جذبہ
وہی اپنائیت کا سا تبسم زیر لب
روزمرہ کے کسی معمول میں آیا نہ ہو جیسے خلل

بت گری

علی ظہیر

تمھارا آدمی تھا وہ
کہ اب جس کے بتوں کو تم گراتے ہو
تم ہی نے تو بنایا تھا اسے
تمھارے سنگ تراشوں نے
تراشے تھے وہ بت سارے

جو تم کہتے ہو وہ جلاد تھا
قاتل تھا، خونی تھا
تمھیں کو مطمئن کرنے
گلے گھونٹے تھے اس نے سیکڑوں آزاد بندوں کے
تمھاری ہی تو تھیں شاباشیاں اس کے مظالم پر
یہ جب تم کو لگا
وہ اب تمھاری بھی نہیں سنتا
تو اب ایک دم سے وہ قاتل بھی ٹھہرا اور جابر بھی
پھر تمھیں نے سیکڑوں معصوم انسانوں کو کچلا
بھوک، بیماری، تباہ حالی سے مرتے
بے بسوں لاچار انسانوں کو مارا
تم پھر اب یہ چاہتے ہو
اک نیا بت اپنے تیشوں سے بنانا

مگر مشکل ہے اب
کہ سارے پتھروں نے خون اتنا پی لیا ہے
کہ جس پتھر پہ تم تیشہ چلاؤ گے
وہاں سے خون کی ندیاں ہی پھوٹیں گی

غزل

چندر پرکاش شاد

تمام وسعتوں کو پار کرنے والا ہوں
میں اپنے آپ پہ یلغار کرنے والا ہوں
ہر ایک درد کو مسمار کرنے والا ہوں
جہان زرد کو گلزار کرنے والا ہوں
میں گذری منزلیں پھر پار کرنے والا ہوں
گذشتہ دور کو سرشار کرنے والا ہوں
یہ غیر وقت کہیں اور سے گذر جائے
میں اپنے لمحوں کو دیوار کرنے والا ہوں
کہ اپنی گرم مزاجی کا ہوں ستایا ہوا
اب اپنے نام پہ بھی وار کرنے والا ہوں
سبھی تباہیاں میرے وجود میں رکھ دو
میں اپنے جرم کا اظہار کرنے والا ہوں
اب اپنے دوسرے کو کاٹ کر فنا کردوں
یہ حادثہ سربازار کرنے والا ہوں
شکستہ لفظ ہیں آنے لگے اڑتے ہوئے
میں جیسے پھر کوئی اقرار کرنے والا ہوں
تم اپنے آپ کو میری حدوں میں آنے دو
نہفتہ حاشیے بیدار کرنے والا ہوں
میں لخت لخت ہی ہو کر نکل پڑوں گا ابھی
تمام راستہ ہموار کرنے والا ہوں

جمیل الرحمٰن

خواب کی لو سے چمک اٹھتی تھیں راتیں اپنی
خواہش دید سے روشن رہیں آنکھیں اپنی

گھل کے دریا میں جہاں قوس قزح بہتی ہے
چھوڑ آیا ہوں اسی موڑ پہ یادیں اپنی

بات کھل جائے روانی میں تو حیرت کیسی
شہر یاروں کی نہیں ہوتیں زبانیں اپنی

پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتی زمانے کی ہوا
ہم جگر تھامیں کہ دستار سنبھالیں اپنی

دیکھ کر اس کو اچانک مرے آنسو امڈے
اس نے بھی ہنستے ہوئے کھول دیں بانہیں اپنی

ہم جمیل اتنے اکیلے تھے قفس چیخ اٹھا
جب ڈھلیں حرف دعا میں سبھی سانسیں اپنی

نگاہ شوق ملی تو روز وحشت میں
زمین رنگ بدلتی ہے دشت غربت میں

لبوں کو چوم کے آہستگی سے چھوڑ دیا
بہت تو رکھے بھرم وصل کے محبت میں

بہت اداس بہت ہی الگ تھلگ رہنا
یہ زندگی ہے کہ بیوہ ہے کوئی عدت میں

وہ آرزو ہی کبھی دل پہ منکشف نہ ہوئی
کہیں کا رکھا نہیں جس نے رنج و راحت میں

جمیل آبلہ پائی سے پھول کھل اٹھتے
پیمبروں سی نہ تھی بات اپنی ہجرت میں

کیفیت وصال ابھی تک ہے دھیان میں
ہم چاند پر تھے اور زمیں آسمان میں

یہ کشتیاں رہیں گی ہواؤں کی منتظر
جب تک چھپی ہے سمت کسی بادبان میں

میں اس گمان میں رہا کہ تیر ہی تو ہے
رکھی ہوئی تھی کائنات اس نے کمان میں

اب تک نہیں کھلا کہ ہوئی تیز جب ہوا
تتلی نے گل سے کیا کہا اپنی زبان میں

اندر کسی افق پہ اگا مہر غم جمیل
اور تیز دھوپ پھیل گئی جسم و جان میں

عرفان صدیقی، نیر مسعود، شمس الرحمن فاروقی

پہلی نشست

عرفان صدیقی۔ اردو میں کسی شاعر یا ادیب کی دعا شاید ہی اس سے زیادہ قبول ہوئی ہو جتنی کہ یہ دعا

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے

یہ میر انیس کی دعا تھی۔ میر انیس کے سلسلے میں ان کی تفہیم کے مختلف پہلوؤں پر بات کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ان کا اسی مرثیے کا ایک بند اور پڑھ دوں۔ اس سے کچھ اس انداز کا ہم کو اشارہ مل جائے گا جس پر ان کا ذہن کام کرتا تھا۔ فرماتے ہیں۔

نازاں ہوں عنایت پہ شہنشاہ زمن کی
بخشی ہے رضا جائزہ، موج سخن کی
چہرے کی بحالی سے قبا چست ہے تن کی
لو برطرفی پڑگئی مضمون کہن کی
اک فرد پرانی نہیں دفتر میں ہمارے
بھرتی ہے نئی فوج کی لشکر میں ہمارے

شمس الرحمن فاروقی۔ واہ واہ، سبحان اللہ۔

عرفان صدیقی۔ تو اس طرح سے پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مرثیے کا رنگ و آہنگ جو ان سے پہلے تھا اور ان کے بعد بھی جو کچھ رہا، اس سے بالکل الگ اور منفرد ایک ان کا انداز ہے۔ مرثیے کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے تفہیم کے مختلف پہلو ذہن میں آتے ہیں، خصوصاً انیس کے حوالے سے۔ سب سے پہلے تو لفظیات کا معاملہ ہے اور یہ اتنا اہم پہلو ہے انیس کی شاعری کی تفہیم کا کہ بات کی ابتدا اسی سے کی جائے۔ تو میں یہ چاہتا ہوں کہ عام طور پر جو یہ طے کرلیا گیا ہے کہ مثال کے طور پر انیس اور دبیر کے موازنے میں یہ بات کہی گئی اور عموماً اس کے بعد بھی یہ بات کہی جاتی ہے، کہ انیس کے یہاں فصاحت بہت ہے، تو ایک سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ کیا فصاحت مخل بلاغت ہے یا فصاحت، بلاغت کی ہی بہترین شکل ہے؟ کیا فصاحت کے بغیر بلاغت ممکن ہے اور کیا فصاحت کی کوئی ایسی شکل ہے جو بلاغت سے جدا اور الگ کوئی چیز ہو؟ اگر یہ طے ہو جائے تو یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ میر انیس کا جو یہ دعویٰ تھا کہ

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہ دعویٰ کسی حد تک حق بجانب ہے۔ اگر ہم لوگ یہ طے کرلیں کہ اس چیز کو جسے ہم نے میر انیس کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، یعنی فصاحت، اس کا تعلق بلاغت سے کیا ہے اور آیا وہ فصاحت بلاغت کی بلند ترین شکل ہے یا نہیں؟ نیر مسعود صاحب، آپ فرمائیں آپ کا کیا خیال ہے؟

نیر مسعود۔ بھئی عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ بلاغت کے لیے فصاحت شرط ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے اور یہ ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ الگ الگ آپ دیکھیے تو فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ سریع المفہوم الفاظ ہوں، زبان پر آسانی سے جاری ہو سکیں، اگر جملہ ہے تو اس میں تعقید نہ ہو۔ بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ کلام مناسب محل ہو۔ اب اگر کوئی محل ایسا ہے جہاں آپ کو ٹوٹی پھوٹی زبان دکھانا چاہیے تو آپ کی فصاحت کہاں جائے گی؟

شمس الرحمن فاروقی۔ ہاں۔

نیر مسعود۔ مثال کے طور پر، میر انیس ہی کا ذکر ہے تو ان کی ایک بیت ہے۔

بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا

یہ فصیح تو نہیں ہے، "بھاگڑ پڑی" اور "بڑھ گیا"...

عرفان صدیقی۔ جی ہاں، "ڑ" کی تکرار...

نیر مسعود۔ مگر اس میں بلاغت ہے۔ جنگ کی ہلچل دکھا رہے ہیں، اس کے لحاظ سے یہ الفاظ مناسب ہیں۔ تو یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ بلاغت نہ ہو نہیں سکتی اگر ہم فصاحت کو ملحوظ رکھیں گے۔ اور تعقید کی تو خیر بکثرت مثالیں ہیں ہی۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ ہاں ہاں، بے شک۔

نیر مسعود۔ تو، یا تو ہم فصاحت کا کوئی دوسرا مفہوم لیں یا یہ سمجھیں کہ بلاغت کے لیے ہم کو دوسری طرح کی فصاحت مطلوب ہے۔ یا فصاحت فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے، اگر محل کے مناسب ہے تو وہ فصیح کلام ہے، ورنہ غیر فصیح۔ مثال کے طور پر بعض افسانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رکشے والا ہے اور بڑی فصیح و بلیغ زبان بول رہا ہے، تو یہ تو عرفان صاحب شبلی، بلکہ شبلی کے پہلے سے ایک محاورہ سا بن گیا تھا کہ میر صاحب کا کلام فصیح ہے اور مرزا صاحب کا بلیغ۔ تفہیم انیس کے جو زیادہ پیچیدہ مسائل ہیں ان کی نوعیت تقریباً انھیں شرائط کی ہے جو شرائط غزل کی تفہیم کے ہیں اور جو اکثر ہم لوگوں کی پچھلی گفتگوؤں میں زیر بحث آچکے ہیں کہ غزل کا نظام، غزل کی دنیا، ہماری اصل دنیا سے کچھ الگ ہے، یا جیسی بھی ہے اس کو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ ہاں، بالکل صحیح ہے۔

نیر مسعود۔ غزل کا محبوب خونریز ہوتا ہے۔ اس پر بحث نہیں کرنا چاہئے کہ ایک نرم و نازک عورت ہے اور جناب قتل کر رہی ہے۔ لیکن آپ اسے مان لیجئے، ورنہ غزل کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح، عاشق شرابی اور رند ہوتا ہے، زاہد ریاکار ہوتا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے۔ اسی طرح مرثیے میں بھی کچھ مسلمات ہم کو تسلیم کرنا پڑیں گے اور پھر ان کو ہم عقل کے یا تاریخ کے معیاروں پر نہیں پرکھیں گے۔

عرفان صدیقی۔ جی۔

نیر مسعود۔ تو یہ نظام، ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر شعری نظام ہے۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ ذیلی نظام ہیں۔ مثلاً اس کا تاریخی نظام ہے کہ عام تاریخ اور خصوصاً تاریخ مذہب، اس کا ہم کو علم ہونا چاہئے۔ وہ تاریخ جو مرثیے میں کام آئے گی۔ اعتقادی نظام، وہ بہت ہی اہم ہے کہ شاعر کا کیا عقیدہ ہے، امام حسینؑ، واقعۂ کربلا کے ہیرو ہیں، ان کی کیا حیثیت تھی، ان کے کیا اختیارات تھے، کس حد تک وہ معجز نما تھے، وغیرہ۔ پھر بیانیہ نظام ہے، گویا جب ہم مرثیے کو بہ طور افسانے کے پڑھیں تو اس کا نظام اور ہی قرار پائے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ بالکل درست۔

نیر مسعود۔ اس سے ہم کو بحث نہیں کہ کس مہینے میں واقعۂ کربلا رونما ہوا تھا، اس وقت وہاں کا ٹمپریچر کیا تھا۔ ہم کو مان لینا چاہئے کہ آگ برس رہی تھی، وہاں اتنی گرمی تھی۔ یا یہ کہ اس صحرا میں گلاب کا پھول کہاں اور گھاس کہاں؟ اگر یہ بیت آئے گی

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تو اس پر ہم کو بحث نہیں کرنا ہے کہ وہاں شبنم تھی بھی کہ نہیں تھی، گھاس تھی بھی کہ نہیں۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح یہ بات کہی گئی ہے؟ تو اس نظام کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بات پھر وہی گھوم پھر کر آئی کہ ہمیں مرثیے کو خالص شاعری کی حیثیت سے دیکھنا ہوگا۔

عرفان صدیقی۔ درست ہے، اس لیے کہ شاعری کی تفہیم ایک تو مجموعی طور پر شاعری کی حیثیت سے ہوتی ہے...

نیر مسعود۔ جی ہاں۔

عرفان صدیقی۔ ...اور پھر مختلف اصناف کے، جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا، اپنے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ان کا نظام بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک بڑی خیال انگیز بات جو ابھی آپ نے فرمائی ہے میں چاہتا ہوں کہ... چونکہ فاروقی صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو ذرا آگے بڑھایا جائے۔ یعنی ہم اتنا کہہ کے شاید انیس کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے کہ فصاحت محض کوئی ایسی چیز تھی جس کا رشتہ بلاغت سے نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میرے اپنے ذہن میں کچھ باتیں ہیں۔ مثال کے طور پر، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ فصاحت کے لیے یہ مان لینا کہ وہ بلاغت سے غیر کوئی چیز ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے نہیں سمجھ میں آتا کہ بلاغت کی ایک معنوی حیثیت ہے اور فصاحت کی ایک ظاہری اور خارجی حیثیت ہے۔ مثلاً یہ کہ الفاظ فصیح بھی ہو سکتے ہیں، غیر فصیح بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن الفاظ بے معنی نہیں ہو سکتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ ہاں، بہت خوب۔

نیر مسعود۔ بالکل صحیح۔

عرفان صدیقی۔ اور جب الفاظ بے معنی نہیں ہو سکتے تو یقیناً بلیغ ہوں گے۔ تو میں یہ چاہتا تھا کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ معنوی حیثیت سے انیس کی فصاحت ہماری رسائی کتنی دور تک کراتی ہے۔ کیوں نہ فاروقی صاحب کچھ اس اعتبار سے ان کے کلام پر روشنی ڈالیں کہ فصاحت نہ صرف یہ کہ میرے خیال میں مخل بلاغت نہیں ہے بلکہ اور بلاغت میں اضافہ ہوا ہے جہاں میر انیس نے فصاحت سے کام لیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ اصل میں، عرفان صاحب اور میر نیر مسعود صاحب، آپ دونوں نے بنیادی باتیں سب کہہ دیں اپنے اپنے بیانات میں، کہ تفہیم انیس کے جو مسائل ہیں، وہ کیا ہیں؟ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر میر انیس کی وہ تحسین نہیں کر پاتے اور میر انیس کی شاعری کے بارے میں وہ رائے نہیں قائم کر پاتے جس کی وہ مستحق ہے۔ اس کی وجہیں کیا ہیں وہ آپ دونوں حضرات نے بڑی حد تک، بنیادی باتیں، بیان کر دیں۔ میں انھیں کے حوالے سے کچھ عرض کرتا ہوں۔ مثلاً یہ جو معاملہ ہے فصاحت و بلاغت کا۔ بہت اچھی بات کہی عرفان

صاحب نے کہ الفاظ فصیح یا غیر فصیح ہو سکتے ہیں لیکن بے معنی نہیں ہو سکتے۔ اگر لفظ میں معنی ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وہ بلیغ بھی ہوگا، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے پہلے تو ہم اپنے ذہن سے یہ تصور نکال دیں۔ فصیح اور بلیغ کا۔ اور خاص کر اس حوالے سے نکال دیں کہ انیس کا کلام فصیح ہے، انیس کے یہاں فصاحت ہے اور دبیر کے یہاں بلاغت ہے، کیونکہ اس طرح کی جو دو چار پانچ رائیں ہمارے یہاں چل پڑی ہیں...

مسعود۔ ٹکسالی فقرے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ ...میر کے یہاں آہ ہے اور سودا کے یہاں واہ ہے، اور میر حسن کے یہاں سلاست اور روانی ہے اور دیا شنکر نسیم کے یہاں صنائع لفظی ومعنوی کے کارنامے ہیں۔ یہ اس طرح کی رائے ہے جو کہ جتنا ہمیں بتاتی ہے، اس سے زیادہ ہمیں گمراہ کرتی ہے۔ تو پہلے تو اس سے ہم بالکل صرف نظر کر لیں۔ لیکن اگر عرفان صاحب ضد کریں کہ نہیں، ہم صرف نظر نہیں کرتے اور میر صاحب ہمارے کہیں کہ صاحب شبلی نے لکھا ہے، تو آپ کون ہوتے ہیں اس سے بچنے والے، تو میں عرض کیے دیتا ہوں کہ فصاحت بہر حال ایک تصور ہے جس کی حیثیت محض خیالی ہے۔ مثلاً کوئی لفظ ممکن ہے کہ دکن میں فصیح ہو، وہاں کے شرفا بولتے ہوں، وہاں کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہوں، وہاں کے ادبا بولتے ہوں، علما بولتے ہوں اور ممکن ہے کہ لکھنؤ میں فصیح نہ ہو۔ کوئی لفظ ممکن ہے کہ دلی میں فصیح ہو لیکن اس کو عظیم آباد کے لوگ غیر فصیح مانتے ہوں، اور اس کا الٹا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کی مثالیں میں نے ایک آدھ جگہ اپنی تحریروں میں پیش ہیں۔ ایک مثال فوری طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ ''درماہہ'' میں نے زندگی میں صرف ایک بار سنا ہے اور وہ بھی بہار میں، ورنہ وہ مصحفی کے یہاں تو ملتا ہے کہ ع

ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

تنخواہ کے معنی میں، میں سمجھتا تھا کہ یہ لفظ ختم ہو چکا ہے، غیر فصیح ہے، متروک ہے، لغو ہے، کوئی اس کا زندہ کرنے والا، بولنے والا نہیں ہے۔ لیکن عظیم آباد کے شرفا اب بھی بولتے ہیں کہ ''درماہہ لینے گئے ہیں''۔ یا اس طرح ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو عظیم آباد میں متروک ہیں، مثال کے طور پر چڑیوں کے کھانے کی جو چیز ہوتی ہے جسے ہم لوگ ''کاکن'' کہتے ہیں، دلی والے ''کنگنی'' کہتے ہیں۔ عظیم آباد میں ''کاکن'' متروک ہے، ''کنگنی'' مستعمل ہے۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ فصیح کا جو تصور ہے، یہ محض خیالی ہے۔

عرفان صدیقی۔ درست ہے، اس کا کوئی قائم بالذات...

شمس الرحمن فاروقی۔ جی ہاں، کوئی قائم بالذات معیار نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ جس لفظ کو یا جس استعمال کو میر انیس فصیح قرار دے رہے ہوں اور فرما رہے ہوں کہ صاحب یہ آپ کے یہاں نہیں مگر ہمارے عظیم آباد میں اس طرح بولتے ہیں، آپ کے لکھنؤ والے اسے کہیں گے کہ ہمارے یہاں فصیح نہیں ہے۔ یا دلی میں جس محاورے کو یا جس لفظ کو داغ فصیح کہہ رہے ہیں، اس کو حیدر آباد کا یا لکھنؤ کا شخص کہے گا کہ فصیح نہیں ہے۔ تو اس لیے میں نے عرض کیا کہ جو چیز محض خیالی، تصوراتی ہے اس کے اوپر تنقید کا معیار قائم کرنا خطرناک ہوگا کیونکہ وہ بنیادی طور پر اپنا ہی معیار ہوگا، کہ میرے لیے فصیح کیا ہے۔ اب مہذب صاحب مرحوم نے اپنے ''مہذب اللغات'' میں ہزاروں الفاظ کو لکھ دیا غیر فصیح۔ مثلاً جو الفاظ کہ ان کے خیال میں فحش ہیں وہ غیر فصیح ہو گئے، وہ الفاظ جو ان کے خیال میں پورب میں بولے جاتے ہیں، وہ غیر فصیح ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔ تو کسی بھی شاعر کے بارے میں یہ کہنا کہ فصاحت معیار ہے اس کے کلام کا، یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اچھا اب اگر جیسا خود فرمایا، اور میر صاحب نے بھی یہ بات کہی، پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ بلاغت بے فصاحت ناممکن ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں...

عرفان صدیقی۔ جب فصاحت کا کوئی معیار ہی نہیں ہے...

شمس الرحمن فاروقی۔ جی ہاں، کوئی معیار نہیں ہے، تو پھر فصاحت اور بلاغت کے بارے میں ہم کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ... بلاغت سے مراد یہ ہے کہ کلام مناسب حال ہو۔ تو مناسب حال ہونے میں اکثر یہ بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ بیکٹ کا ڈراما ''ویٹنگ فار گوڈو'' Waiting for Godot ہے، جگہ جگہ بلیغ ہے، بے انتہا، لیکن غیر فصیح اس قدر ہے کہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ تو اس بات کو تو فی الحال ترک کیجیے آپ۔ اصل میں جو مشکل ہے کہ ہم لوگ میر انیس کو... کوئی کہتا ہے ہومر ہند، کوئی کہتا ہے شیکسپیر ہند، کوئی کہتا ہے کہ فردوسی ہند... کوئی ان کو اپنا شاعر نہیں کہتا۔

نیر مسعود۔ سب کچھ ہیں وہ، انیس نہیں ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی۔ جی ہاں، انیس نہیں ہیں۔ جیسا کہ میر صاحب نے کہا کہ وہ سب کچھ ہیں، مگر انیس نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس بات کو کہ روسی ہیئت پرستوں نے پہلی دفعہ، مطلب یہ ہے کہ مغرب میں، پہلی دفعہ کہا، ہمارے یہاں وہ اصول پہلے سے تھا لیکن ہم لوگ بھول گئے تھے، کہ ادب ایک نظام ہے۔ اس نظام کے کچھ قوانین ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میر صاحب نے فرمایا کہ مثلاً غزل کے کچھ قوانین ہیں۔ ادب ایک نظام ہے، اس نظام کے نیچے بہت سے تحت نظام ہیں، مثلاً غزل کا ہے، مرثیے کا ہے، قصیدے کا ہے، رباعی کا ہے، مثنوی کا ہے، اور وہ ان کے اپنے اپنے نظام ہوں گے لیکن جتنے Sub systems ہیں وہ سب ادب کے سسٹم کے اندر ہی ہیں۔ اس کے

باہر نہیں ہیں۔ یعنی جو مشرقی سسٹم ادب کا ہے، اس کے ماتحت رکھ کے آپ دیکھیں تو آپ کو پتہ لگے کہ میر انیس کس طرح کے شاعر ہیں۔ ہومر سے، فردوسی سے بھی آپ ان کو نہیں ملا سکتے، کیونکہ یہ نظمیں جن کو ہم مرثیہ کہتے ہیں، نہ تو یہ رزمیہ ہیں اور نہ ڈراما ہیں اور نہ کوئی طویل نظم ہے۔ بلکہ یہ مرثیہ ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا چاہئے کہ یہ مرثیہ ہے۔

عرفان صدیقی۔ یہ اپنے میں ایک الگ ہی...

شمس الرحمن فاروقی۔ جی ہاں، ایک الگ چیز ہے۔ پھر یہ کہ چیز بھی ہے کہ اس کے بعض مخصوص شرائط اور لوازم ہیں، مثلاً اس کا زبانی پن، کہ مرثیہ زبانی پڑھا جاتا تھا۔ مجمع میں سنانے کے لیے یہ چیز تھی۔ زبانی ادب کے، یا زبانی فن پارے کے خواص کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ ہم لوگوں نے طے نہیں کیے۔ تو ہم لوگوں کو پہلے تو چاہئے کہ یہ دیکھیں کہ یہ شخص کس نظام کا رکن ہے، اور اس نظام کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ اگر وہ تقاضے ادب العالیہ سے متحارب ہیں تو ہوں گے، کوئی بات نہیں۔ پہلے تو ہم اس نظام کے تقاضوں کو دیکھیں۔ مثلاً لوگوں نے کہا کہ صاحب مرثیے کے کردار تو لکھنؤ والوں کی طرح روتے دھوتے ہیں، امام حسین کیا ہوئے کہ معلوم ہوا کوئی صاحب بسور رہے ہیں، رو رہے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ ارے بھئی اگر اس نظام کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مرثیے میں کچھ ایسے بند یا ایسے مقامات ہوں جہاں کہ لوگ روئیں، جہاں کہ لوگ آہ و بکا کریں، تو ضروری ہے کہ شاعر آہ و بکا کے لیے ایسے ہی لوازم کو لائے جو کہ اس تہذیب کا حصہ ہوں۔ چین جاپان میں کیسے روتے ہیں، ہم کو اس سے کیا لینا دینا؟ ہم تو ایسے ہی روتے ہیں کہ ہم سینہ پیٹتے ہیں۔ بال نوچتے ہیں۔ یہ ضروری ہے۔

عرفان صدیقی۔ فاروقی صاحب، یہ بہت اہم پہلو ہے اور اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہم لوگوں کو بات کرنی چاہئے۔ اور اگلی نشست میں انشاءاللہ کریں گے بھی۔ فی الحال جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ ہے کہ اس سے میرے خیال میں ہم سب کو اتفاق ہوگا، نیر مسعود صاحب کو بھی، کہ پہلے تو جس صنف میں یا جس نظام میں شاعر نے شاعری کی ہے اس نظام کے اپنے بنیادی لازموں کو سمجھ لیا جائے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ درست ہے، بالکل درست۔

عرفان صدیقی۔ اور یہ بات جب روشن ہو جائے گی تو پھر تفہیم میں یہ رکاوٹیں نہیں پیش آئیں گی کہ صاحب یہ منظر تو دکھا رہے ہیں کربلا کا اور پھر یہ کیا کر رہے ہیں کہ سبزہ بھی لہلہا رہا ہے... یا یہ کہ امام حسین رخصت ہونے آتے ہیں اہل حرم سے تو اس طرح رخصت ہوتے ہیں جیسے بلا تمثیل ہم اپنے گھر والوں سے بچھڑتے ہوئے کچھ کہتے ہوں۔ یہ مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ پہلو وہ ہے جس پر ہم لوگ آئندہ نشست میں غور کریں گے۔ اس وقت ایک بڑی اہم بات یہ سامنے آئی کہ فصاحت بذات خود کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کا خارج میں کوئی وجود ہو۔ انتہائی ثقیل الفاظ کے باوجود کوئی فن پارہ فصیح ہے، اور نہیں بھی ہوسکتا۔ رواں ترین، سلیس ترین الفاظ کے باوجود نہیں ہوسکتا۔ اصل چیز یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے تقاضے کیا کسی مخصوص سچویشن کے یا کسی مخصوص صنف کے؟

نیر مسعود۔ بلکہ اب یہی کہنا چاہئے کہ اگر لوگ مصر اسی پر ہیں کہ فصاحت وہ ہے جس میں الفاظ رواں ہوں اور آسانی سے زبان سے ادا ہوسکیں وغیرہ، اور بلاغت وہ کلام ہے جو مقتضائے محل کے مطابق ہوتو ہم پر تیار ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ انیس کے یہاں فصاحت نہیں ہے۔

عرفان صدیقی۔ نہیں ہے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ ہاں ہاں، ہم مان لیں گے۔

عرفان صدیقی۔ اور ایسا ماننے میں انیس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

نیر مسعود۔ جی نہیں، کوئی نقصان نہیں۔

عرفان صدیقی۔ بلکہ انیس کی تفہیم کے راستے کچھ اور روشن ہو جائیں گے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ صحیح ہے۔

عرفان صدیقی۔ شکریہ۔ یہ نشست تمام ہوتی ہے۔

دوسری نشست

عرفان صدیقی۔ میر انیس کی تفہیم کے سلسلے میں پچھلی گفتگو میں نیر مسعود صاحب آپ نے اور فاروقی صاحب نے بھی ایک بات کی طرف اشارہ کیا تھا جو میرے خیال میں بہت بنیادی بات ہے کہ کسی فن پارے کے اپنے نظام کو طے کرنے کے بعد ہی اس کی تفہیم کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوسکتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ فاروقی صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ طے کرلیا جائے گا کہ مرثیے کے ہمارے مشرقی نظام کے تحت اس کے تقاضے یہ ہیں اور ان تقاضوں کی شاعر کامیابی کے ساتھ پیروی کر رہا ہو یا ان تقاضوں کو پورا کر رہا ہوتو اس پر یہ اعتراض وارد کرنا ایک فضول اور لغو چیز ہوگی کہ اس نے امام حسین کے گھر والوں کو اس طرح روتے ہوئے دکھایا ہے جیسے عرب کے لوگ نہیں روتے ہیں۔ نہ روتے ہوں گے، لیکن یہ بہت بنیادی بات ہے کہ جب یہ طے ہوگیا کہ ہمارے مرثیے کا نظام بکا یہ ہے تو ہم اس معیار کے تحت یہ دیکھیں گے کہ اس نظام کو کس حد تک شاعر نے برتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ صحیح ہے۔

عرفان صدیقی۔ ایک بات جو عام طور پر میر انیس کے سلسلے میں بلکہ عام مرثیہ نگاروں کے سلسلے میں کہی جاتی ہے، اور میر انیس نے چونکہ اس میں زیادہ کمال دکھایا ہے اس لیے میر انیس پر یہ اعتراض زیادہ ہوتا ہے،

میں اسے اعتراض ہی کہوں گا، کہ صاحب وہ جب، مثال کے طور پر میدان کربلا کا نقشہ دکھاتے ہیں، منظر دکھاتے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدان کربلا کوئی صحرا کوئی ریگ زار نہیں تھا بلکہ بہت ہی شاداب اور سرسبز علاقہ تھا۔ اصل میں معاملہ یہ ہے، میرے خیال میں، کہ دو پہلو ہیں، دونوں اعتراض ایک جگہ جا کر مل جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی خارجی مرقع نگاری کے بارے میں جب یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے میدان کربلا کو ایک گلستان بنا دیا، تو اس کی تہ میں بھی وہی چیز ہے اس اعتراض کی تہ میں ہے کہ انھوں نے حرم امام حسین علیہ السلام کو اس طرح روتے دکھایا جس طرح سے بلا تمثیل ہمارے گاؤں کی عورتیں روتی ہیں۔ ان دونوں اعتراضوں کی تہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جیسا کہ فاروقی صاحب نے فرمایا تھا پچھلی بار، کہ اس نظام کو نہیں سمجھا گیا جس کے تحت مرثیہ قائم ہوتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ درست۔

عرفان صدیقی۔ تو اس سلسلے میں میری ایک عرض ہے۔ مرقع نگاری کے معاملے میں تفہیم کی مشکل میر انیس نے شاید ایک حد تک خود حل کر دی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں ؎

جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا
دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا یہ اوج زمیں ہوا
خورشید محو حسن حسینؑ حسیں ہوا
پایا فروغ نیر دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

شمس الرحمن فاروقی۔ واہ واہ، بہت خوب۔

عرفان صدیقی۔ تو یہ بات میر انیس نے ایک طرح سے خود ہی طے کر دی کہ دشت بلا تو تھا ہی لیکن وہ نمونۂ خلد بریں بھی ہے۔

نیر مسعود۔ جی ہاں۔ اس کے بعد کا بند بھی آتا ہے۔

عرفان صدیقی۔ جی ہاں۔ پھر وہ کہتے ہیں ؎

یہ دشت ہولناک کہاں یہ چمن کہاں
جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں

شمس الرحمن فاروقی۔ واہ واہ۔

عرفان صدیقی۔ میرے خیال میں ایک پہلو سے تفہیم کی ایک بنیادی رکاوٹ انھوں نے خود رفع کر دی ہے کہ دشت بلا دشت بلا ہے، اس کو نمونۂ خلد بریں ہم اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں اس مرثیے کے نظام کے تقاضوں کے تحت اس کو اس جگہ پر نمونۂ خلد بریں تصور کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کا پھر موازنہ یا Contrast یا مقابلہ ان مصائب سے اور ان مشکلات سے کیا جا سکے جو، مثال کے طور پر، ایک ریگ زار میں اور ایک ریگ زار میں ہونے والی کارزار میں پیش آتی ہیں۔

نیر مسعود۔ یہ بہت عمدہ نکتہ ہے عرفان صاحب۔

عرفان صدیقی۔ تو ایک تو یہ پہلو میرے ذہن میں آیا ہے، دوسرا وہی باطنی مرقع نگاری جس کو جذبات نگاری ہم کہہ سکتے ہیں۔ اس کے سلسلے میں یہ ہے کہ بہت اچھی اور بنیادی بات یہ طے کر دی فاروقی صاحب نے جس سے پورا اتفاق ہونا چاہئے کہ ایک بنیادی جذبہ ہے، مثال کے طور پر، کسی سچویشن میں ترحم کو ابھارنے کا مقصود ہے شاعر کا۔ تو اب اس کے لیے قطعی جائز ہے کہ وہ اس ترحم کے جذبے کو ابھارنے کے لیے جتنے Tools چاہے استعمال کرے، اور اس کے Tools پر ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں ان کے استعمال میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس پر اعتراض ہونا چاہئے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ ہاں، درست۔ بہت عمدہ بات کہی۔

عرفان صدیقی۔ تو اس سلسلے میں میں چاہتا تھا کہ نیر مسعود صاحب اس بات کو کچھ زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔

نیر مسعود۔ عرفان صاحب آپ نے یہ بہت پکی بات کہہ دی۔ دو بند میں پڑھے دیتا ہوں۔ اب ظاہر ہے بتانے کی ضرورت نہیں کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد مظاہر فطرت پر کیا اثر ہو رہا ہے ؎

خورشید چھپا گرد اڑی زلزلہ آیا
اک ابر سیہ دشت پر آشوب پہ چھایا
پھیلی تھی جہاں دھوپ وہاں آ گیا سایہ
بجلی کو سیاہی میں چمکتا ہوا پایا
جو حشر کے آثار ہیں سارے نظر آئے
گرتے ہوئے مقتل میں ستارے نظر آئے

شمس الرحمن فاروقی، عرفان صدیقی۔ واہ واہ۔

نیر مسعود۔ [دوسرا بند پڑھتے ہیں]

ہر شے سے عیاں تھا غم سبط شہ لولاک
سر زانوئے غم پر تھے جھکائے ہوئے افلاک
دریا کا بھی موجوں سے سراسر تھا جگر چاک
اللہ رے ماتم کہ اڑاتی تھی زمیں خاک
آوارہ پرندے تھے مکاں خالی پڑے تھے
چوپائے چراگاہ سے منھ پھیرے کھڑے تھے

تو یہ جیسے واقعیت کا بھی ذکر آ رہا ہے اور مرثیے کے نظام کا بھی، تو میں یہ کہتا ہوں کہ کیا کسی داستان کے ہیرو کی وفات پر یہ سب کہا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں کہا جا سکتا۔

عرفان صدیقی۔ درست۔

نیر مسعود۔ تو یہ بات ہم نے تسلیم کر لی، ایک عظمت، کہ امام حسین کی شہادت پر ایسا ہو سکتا ہے، فطری مظاہر میں ایک ابتری پیدا ہو سکتی ہے۔ اور پھر وہی جیسا آپ نے فرمایا کہ شاعر اس ابتری کو جتنی اچھی طرح دکھائے گا اتنا زیادہ وہ ہم اس کے کمال کے قائل ہوں گے۔

شمس الرحمن فاروقی۔ ہاں، درست ہے۔

نیر مسعود۔ اس پر بحث تھوڑی کریں گے کہ صاحب ایک آدمی کے مرنے پر یہ سب تھوڑی ہوتا ہے۔ اور زانوے غم پر افلاک کا سر جھکنا کیا مطلب؟ فاروقی صاحب یہ آپ کے میدان کی چیز ہے کہ ہم کو انیس کی تفہیم کئی سطحوں پر کرنا ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ ایک طرح سے مرثیے کا ہر بند ایک نظم ہے، مختصر سہی۔ اور اس مختصر نظم کا ہر مصرع بھی ایک طرح سے تفہیم کرنے والوں، خاص کر فاروقی صاحب کے سے تفہیم کرنے والوں کے لیے تو ہر مصرع تقریباً ایک نظم ہے۔ تو ایک طرف تو ہم کو ہر مصرعے کو آزادانہ پڑھنا، پھر ہر بند کو آزادانہ پڑھنا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ سب بند مل کر ایک واحد مربوط مرثیہ بناتے ہیں۔ تو ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ ایک بند ہے، اس کو ہم نے پسند بھی کیا، لیکن پوری طرح سے اس کے معنی ہم پر نہیں کھلتے جب تک ہم اس کو پورے مرثیے کے سیاق وسباق ہی نہ دیکھیں، بلکہ پورے اس واقعے کے سیاق وسباق میں نہ دیکھیں۔ یعنی جب تک ہم کو معلوم نہ ہو کہ ابھی کیا کیا ہونا ہے۔ وہ بہت مشہور بند ہے جس میں دریا کے کنارے خیمے نصب کرنے پر ایک طرح کی تلخی پیدا ہو گئی ہے گفتگو میں اور حضرت عباس کو غصہ آ گیا ہے۔ چونکہ ہم کو معلوم ہے کہ امام حسین کربلا میں آئے ہیں اور یہیں کے ہو رہیں گے، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عباس کی شہادت پانی لانے کے سلسلے میں ہو گی، دریا کے کنارے، اور ان کا لاشہ اتنا شکستہ ہو گا کہ وہاں سے اٹھ کے جا نہیں سکے گا، چنانچہ آج بھی روضۂ عباس دریا کے کنارے ہے، اور یہ کہ سارے اصحاب، حضرت عباس سمیت امام حسین پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

یہ علم جب ہم کو پہلے سے ہے، یعنی پورا مرثیہ یا مرثیے کا پورا نظام ہمارے علم میں پہلے سے ہے تو اب اس بند کا لطف یا اثر دیکھیے۔ حضرت عباس کہتے ہیں

یاں سے کہیں رسولؐ کا پیارا نہ جائے گا
ہم وہ نہیں کہ جان کو وارا نہ جائے گا
لاشہ بھی اٹھ کے یاں سے ہمارا نہ جائے گا
مر کر بھی ہاتھ سے یہ کنارہ نہ جائے گا
رکھتے ہیں اس زمیں کے لیے سر کو ہاتھ پر
قبضہ ہے تابہ حشر ہمارا فرات پر

پورا واقعہ پہلے سے معلوم ہے، اور یہ سب پوری طرح سمجھنے ہی سے اس...

عرفان صدیقی۔ بند میں اثر پیدا ہوا۔

نیر مسعود۔ یا اس سے بھی عمدہ ایک مثال ہے، جب جناب زینب اپنے صاحبزادوں کے لاشوں پر بین کر رہی ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ عون و محمد کے بعد بس قاسم اور قاسم کے بعد علی اکبر کی باری ہے۔ حضرت علی اکبر کی والدہ کہتی ہیں امام حسین سے کہ بچوں کی لاشوں کو ہٹوا دیجیے ورنہ ڈر ہے کہ زینب کہیں غم کے مارے مر نہ جائیں۔ اور اس کے بعد بیت میں کہتی ہیں

اولاد کا غم خالق عالم نہ دکھائے
اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے

تو یہ... وہی بات ہے۔ فاروقی صاحب سے میں عرض کر رہا تھا کہ دو یا تین طرح سے ہم کو مرثیہ پڑھنا پڑتا ہے، اور بہ یک وقت ہر مصرعے اور ہر بند پر بھی نظر رکھنا ہوتی ہے اور پورے مرثیے پر بھی۔ اس پر خود آپ کا اپنی نوعیت کا پہلا مضمون اور غالباً ابھی تک واحد مضمون ہے جو انیس فہمی کے سلسلے میں بہت ہی اہم چیز ہے۔ اس طرف توجہ، افسوس یہ ہے کہ اور ہر چیزوں کی طرح اس کی طرف بھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ مضمون ہے، ''میر انیس کے ایک...''

شمس الرحمن فاروقی۔ جی، ''میر انیس کے ایک مرثیے میں استعارے کا نظام''۔

عرفان صدیقی۔ جی ہاں۔

نیر مسعود۔ ''بہ خدا فارس میدان تہور تھا حر'' پر وہ مضمون ہے جس میں فاروقی صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ ایک تلازمہ نور اور ظلمت کا اول سے آخر تک ہے۔ اب اس نقطۂ نظر سے دیکھا تو معلوم ہوا ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' قریب دو سو بند کا مرثیہ ہے اور شاید ہی کوئی بند ایسا ہو جس میں کسی نہ کسی طرح بلندی اور پستی کا تلازمہ نہ ہو۔ تو یہ ایک استعاراتی نظام، اس کا مطلب ہے کہ میر انیس کے یہاں...

عرفان صدیقی۔ وہ نور کے استعارے والا تو وہ تھا نہ ''طے کر چکا جو منزل شب...؟''

شمس الرحمن فاروقی۔ جی ہاں وہ بھی ہے، لیکن میں نے تو اس مرثیے کو لیا ہے۔ ''بہ خدا فارس...''

نیر مسعود۔ ''طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح'' بھی... اس نظر سے دیکھیے تو بہت سے مرثیوں میں نظر آتے ہیں، مختلف تلازمے... تو فاروقی صاحب کا چونکہ مطالعہ بہت اچھا ہے، تو اس طرح کی اور مثالیں اردو ہی کے دوسرے شاعروں کے یہاں ملتی ہیں کہ نہیں۔ یعنی اتنے لمبے تلازموں کی؟

عرفان صدیقی۔ ہاں فاروقی صاحب، تفہیم کے سلسلے میں تقابلی مطالعہ بھی ہو جائے۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ میں تو میر صاحب، واقف نہیں ہوں کسی... اول تو یہ کہ طویل نظم، افسوس یہ ہے کہ مثنوی کے بعد جن لوگوں نے کہی ہے وہ زیادہ تر یا تو ادھورے شاعر ہیں یا ناشاعر ہیں۔ لہٰذا ان سے مقابلہ کرنے سے فائدہ نہیں۔ کوئی ایسا نظام شاید تصور میں بھی ان کے نہ ہوگا۔ لیکن خود شعرفہمی اور شعرشناسی کے اصول کے طور پر یہ ہے ایک بنیادی چیز، کہ کیا کسی شاعر کے یہاں کسی قسم کا استعاروں کا، یا تلازموں کا، تشبیہات کا، کسی مخصوص پیکر کا نظام ہے کہ نہیں، اور اس کے ساتھ کون کون طرح کے اور پیکر یا استعارے آتے ہیں جن کو Cluster کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک تو ہمارے یہاں خود ہی موجود ہے کہ صاحب زبان کے اندر رعایتیں ہی اتنی موجود ہیں کہ مثلاً ''جان'' ہے تو ''جہان'' بھی ہو سکتا ہے اس کے نزدیک کہیں موجود ہو۔ ممکن ہے کہ اگر ''شراب'' یا ''شرب'' کہا ہے تو پھر ''مدام'' بھی اس کے پاس پہنچ جائے۔ وہ تو خود اپنی جگہ پر قابل تعریف ہے، لیکن کن کن طرح کی چیزیں ہیں؟ سوال یہ بھی ہے۔ مثلاً ''شراب'' اور ''مدام'' ہے کہ نہیں ہے، اور ہے تو کتنی بار ہے؟ ''جان'' اور ''جہان'' ہے کہ نہیں، ہے تو کتنی بار ہے؟ اس طرح سے بھی دیکھنا چاہیے مرثیے کو۔ جیسا میں شروع میں عرض کر رہا تھا سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے مرثیے کو مرثیہ سمجھ کے نہیں دیکھا ہے۔

عرفان صدیقی۔ بالکل صحیح ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ اور ہونا یہی چاہیے کہ کم سے کم دو طرح سے دیکھیں۔ ایک تو یہ کہ جیسا میں نے اس وقت کہا تھا کہ شاید یہ بکا کے معاملات، یا مبالغے کے معاملات، گھوڑے کی تعریف وغیرہ کے چکر، ممکن ہے کہ یہ چیزیں آپ So-called نام نہاد ادب العالیہ میں نہ دیکھیں۔ اول تو یہی غلط ہے کہ نہ دیکھیں گے۔ پڑھیں گے تو ضرور دیکھیں گے۔ معاف کیجئے گا پڑھا ہی نہیں ہے لوگوں نے۔ مثلاً اگر رزمیہ پڑھیے، مثال کے طور پر یونان میں، تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں بھی ایک رسم ہے چیزوں کو اس طرح سے بیان کرنے کی۔ تو خیر، وہ الگ بات ہوئی۔ ایک تو یہ کہ جو چیزیں کہ تمام ادب میں مسلم ہیں ان کو اٹھایئے۔ مثلاً استعارہ، مسلم ہے کہ بھئی یقیناً شعر کا ایک بہت بڑا وصف ہے استعارہ۔ اس استعارے کی مختلف باریکیاں، اس کے مختلف مدارج اور اس کے مختلف نظام، ان پر گفتگو کر لیں۔ یا یہ کہ تشبیہ اور پیکر کو کیسے کیسے استعمال کرتا ہے کوئی شاعر۔ یا پھر یہ کہ اس طرح کے دوسرے استعارے کتنے ہیں، ان پر گفتگو ہو جائے۔ یہ بھی ہم لوگوں نے کبھی نہیں کی آج تک۔

عرفان صدیقی۔ بہت تہ در تہ استعارے کتنے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ جی ہاں۔ کن مدارج کا استعارہ ہے، کہاں سے کہاں تک پھیلتا ہے، جیسے ابھی مصرع آپ نے پڑھا تھا کہ، کیا تھا وہ ''اولاد کا غم خالق...؟

عرفان صدیقی۔ ...خالق عالم نہ دکھائے''

شمس الرحمٰن فاروقی۔ ہاں۔ ''اولاد کا غم خالق عالم نہ دکھائے''۔ اب ''خالق'' کا لفظ کیوں رکھا؟ بیسیوں لفظ رکھ سکتے تھے، لیکن ''اولاد'' ہے لہٰذا ''خالق'' رکھا۔

نیر مسعود۔ پیدا کرنے والا۔ بہت خوب۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ جی ہاں، پیدا کرنے والے کے لیے، مثلاً وہ بات ''مالک'' میں نہیں ہے۔ یا اور کوئی لفظ رکھ لیجئے آپ۔ تو اس میں وہ بات نہیں آئے گی۔ تو یہ ہے وہ جسے کہنا چاہئے deep structure استعارے کا کہ ''خالق عالم'' بہر حال اللہ میاں کا نام ہے، لیکن اللہ میاں کے تو ہزاروں نام ہیں اور ان میں ہر نام کی ایک اپنی استعاراتی جہت ہے۔ پہلے بھی کبھی عرض کر چکا ہوں میں یہ مناسب نہیں ہے کہ تقصیر کی معافی مانگ رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ اے قہار! میرے گناہوں کو معاف کر۔

نیر مسعود۔ جی ہاں، ''بوتراب'' کا لفظ بھی انیس کے یہاں خاک یا مٹی کے ذکر کے بغیر...

شمس الرحمٰن فاروقی۔ ...مٹی کے بغیر نہیں آئے گا۔ تو یہ چیزیں ہوئیں جو غور کے قابل ہیں۔ پھر یہ کہ، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض نقادوں نے یہ کہا کہ صاحب تلوار کا یا گھوڑے کا ذکر جس انداز میں ہے اس میں دراصل لکھنؤ والوں کی، یا اردو شاعری کی Eroticism اور جنسی حسیت ہے جو...

عرفان صدیقی۔ (ہنسی) جی ہاں۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ جو ادھر کی طرف اس پردے میں آئی ہے۔

عرفان صدیقی۔ یہ تو عجیب وغریب بات ہوئی۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ جی، لیکن لوگوں نے کہا ہے۔ یہ صحیح ہے، کوئی شک نہیں کہ تلوار کے لئے پری کا بھی لفظ لایا گیا ہے اور یہی لفظ معشوق کا بھی ہے۔ لیکن یہ کہ آپ یہ تو سوچیں کہ یہ لفظ کس نظام کے تحت ہے۔ مثلاً ایک نظام تو یہ ہے کہ یہاں ہر چیز کو ہم بار بار بیان کریں گے۔ جو زبانی نظام کا وصف ہوتا ہے، کہ کسی ایک چیز کو ہم تکرار کے ساتھ کہیں گے اور اس کو ہم بڑھا بڑھا کے کہیں گے، کیونکہ اس کے بغیر زبانی کلام سامع تک یا سامعین تک پہنچتا نہیں، پھر سامعین کے ذہن میں محفوظ نہیں رہتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کلام memorable ہو۔ memorability کی بھی صفت یہی ہے کہ آپ بڑھا کے کہیں، تکرار سے کہیں۔ تو یہ سب چیزیں اس کے تقاضے ہیں، زبانی نظام کے۔

زبانی بیانیہ مثلاً ہے، زبانی بیانیے میں یوں ہے کہ پہلے ایک منظر بیان کریں گے، پھر کوئی اور منظر بیان کریں گے۔ ضروری نہیں کہ دونوں میں کوئی براہ راست ربط بھی ہو۔ ایک کے بعد ایک کا سا ہو سکتا ہے۔ ایک کے بعد تین ہے، تین کے بعد چار ہے، چار کے بعد چھ ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ مرثیے کو اس طرح سے دیکھیں کہ مثلاً Timing اس میں کیسی ہے۔ کس وقت شروع ہو رہا ہے، کب ختم ہو رہا ہے۔ اس کے بیچ میں کون کون سے وقت بیان کیے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد کون سا منظر ہے، لیکن اگلا جو ہے وہ دو گھنٹے کے بعد ہے کہ آدھے گھنٹے کے بعد ہے کہ اس سے فوراً پیوست ہے ۔ یہ سب زبانی بیانیے کے مسائل ہیں۔ کیسے ان کو دیکھا جائے، ان پر گفتگو نہیں ہو رہی ہے۔ یہ چیزیں اس لیے کہ... مثلاً اس بات کے کہہ دینے سے کہ صاحب میر انیس کا مرثیہ رزمیہ شاعری کی مثال ہے، یا بے انتہا وہ مرثیے کے تقاضے پورے کرتا... اس میں چہرہ ہوتا ہے، سراپا ہوتا ہے، فلاں مرثیہ اس کی مثال ہے۔ اس سے کام نہیں بنتا ہے، جب تک کہ آپ... مثلاً یہی آپ پوچھ لیجئے کہ کسی ایک مرثیے میں کتنے بند ہیں، ان میں سے کتنے بند بین کے ہیں، اور کتنے بند گھوڑے کی تعریف میں ہیں اور کتنے بند اس میں تلوار کی تعریف میں ہیں؟ ان میں کیا ربط ہے، کس کس وقت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ کون سا مرثیہ صبح سے شروع ہو رہا ہے، کون صبح کے بعد شروع ہو رہا ہے، کون شام کو شروع ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ یہ جو اس کی صفات ہیں، کس کس طرح سے مرثیہ ہمارے سامنے unfold ہوا ہے، یہ دیکھیں ہم۔

فان صدیقی۔ اصل میں یہی کمی رہتی ہے مطالعے میں جو تفہیم کے بہت سے مصائب، مصیبتوں کا بلکہ میں کہوں گا مصائب کا نہیں بلکہ مصیبتوں کا باعث بن جاتی ہے۔

سعود اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ جی ہاں، ہاں۔

عرفان صدیقی۔ اور جو زبانیہ پہلو ہے مرثیے کا، جب تک اس کو ذہن میں نہ رکھا جائے، میرے خیال میں مرثیے کی تفہیم کا بنیادی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

نیر مسعود۔ بہت سے الفاظ انیس صرف اس لیے استعمال کریں گے کہ مرثیہ زبانی سنانا ہے۔

عرفان صدیقی۔ جی ہاں۔

نیر مسعود۔ مرثیہ اگر خالی تحریری صنف ہوتا تو ممکن ہے وہ کوئی اور لفظ استعمال کرتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ بالکل صحیح ہے۔

نیر مسعود۔ مثال ایک، فاروقی صاحب، اس کی یوں ہے۔ ظاہر ہے کہ لہجے کی تو بہت سی مثالیں ہیں ہی۔ جب امام حسین (کربلا میں) آچکے ہیں اور ان کے ایک دو دن بعد ابن سعد کا لشکر آتا ہے۔ تو وہ پوچھتا ہے کہ کیا صورت حال ہے، لوگ بتاتے ہیں، تو ابن سعد کہتا ہے کہ ان سے بیعت کو کہو اب...

بولا کوئی کہ ہے انھیں بیعت سے اجتناب
کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے پیچ و تاب
ہاں اب خیام شاہ میں جانے نہ پائے آب

یہ مصرع میں نے غلط پڑھا (ہنسی)۔ اصل میں یوں پڑھنا چاہیے: "کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے پیچ و تاب"۔ اس کے بعد وہ "ہاں" کہے گا حیرت سے، "ہاں؟" یعنی "اچھا؟"

عرفان صدیقی۔ "ہاں!؟"

نیر مسعود۔ جی۔ اب باقی مصرع پڑھیے: "اب خیام شاہ میں جانے نہ پائے آب"

عرفان صدیقی۔ ہاں، درست ہے۔ تو یہ ہے گویا زبانی بیانیہ کی قوت جس کی طرف فاروقی صاحب نے اشارہ کیا، اس کے بغیر مصرع نہیں سمجھ میں آسکتا۔ شکریہ ☆☆☆

شمس فریدی

بدن

(نذر مقبول فدا حسین)

مکاں لا مکاں کی عجب داستاں ہے
زمین و زماں سے پرے بھی جہاں ہے
جہانوں سے آگے جہاں مل رہے ہیں
وہاں زندگی کے نشاں مل رہے ہیں
جہاں حور و غلماں ہیں باغ عدن ہے
وہاں اک بدن ماورائے بدن ہے
بدن آسماں ہے بدن ہی زمیں ہے
بدن جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
بدن زندگی ہے بدن سرخوشی ہے
بدن راستی ہے بدن بندگی ہے
بدن چاند سورج بدن کہکشاں ہے
بدن یہ جہاں ہے بدن وہ جہاں ہے
بدن ہے سمندر بدن بے کراں ہے
بدن بجلیوں کی چمک میں نہاں ہے
بدن رنگ و بو ہے چمن در چمن ہے
ایلورا اجنتا کے فن میں بدن ہے
بدن موسموں کا نیا بانکپن ہے
بدن میکدہ ہے بدن ہی نشہ ہے
بدن کی مہک سے معطر فضا ہے
بدن ابتدا ہے بدن انتہا ہے
بدن ارتقا ہے بدن میں خدا ہے
بدن جو نہیں ہے خلا ہی خلا ہے
صدا بے صدا ہے فنا ہی فنا ہے

اس جہان بے جہاں میں دل لگا پائیں گے کیا
چھوڑ کر اپنے جہاں کو ہم نہ پچھتاویں گے کیا

جیسی جیسی آنچ سی رہتی ہے جینے میں مدام
موم کی مانند اک دن ہم پگھل جاویں گے کیا

کیوں بضد ہو تم بھی میرے ساتھ چلنے کے لئے
چلتے چلتے پاؤں میں چھالے نہ پڑ جاویں گے کیا

دم بہ دم ہم جل رہے ہیں آگہی کی آنچ میں
اور اس سے بڑھ کے آخر ہم سزا پاویں گے کیا

اک نئی منزل کی جانب تھا سفر کا سلسلہ
رفتگاں اب اس جہاں میں لوٹ کر آویں گے کیا

شاہین عباس

سخن مجھ سے، صدا مجھ سے، گماں مجھ سے، یقیں مجھ سے
زمین خواب پر اترے نہیں اب تک امیں مجھ سے
کنار جاں سے میں اب بھی گذرتا ہوں، مگر کم کم
سو دریا پہلے جیسی گفتگو کرتا نہیں مجھ سے
یہی اک دور آنکھوں میں رہے گا شام آخر تک
بہت مانوس ہو جیسے یہ خواب اولیں مجھ سے
غبار راہ سے غافل ہوں میں اور بھول بیٹھا ہوں
حساب ہر ہی بھی مانگ سکتی ہے زمیں مجھ سے
خدا جانے ہوا کا مسئلہ کیا تھا سر صحرا
ہوا کے کام آئے ہیں کئی صحرا نشیں مجھ سے
بدن بعد بدن ایسا، سفر بعد سفر جیسا
مری آواز پا کو اب کوئی نسبت نہیں مجھ سے
مرے اندر جو خاک اڑتی ہے باہر سے زیادہ ہے
سو دل آگے نہ بڑھ جائے اسی دھن میں کہیں مجھ سے

دل ملیں بھی تو یہی ملنے کی حالت رہے گی
ایک خلوت میں مخل دوسری خلوت رہے گی
اگر اس پار سے آوازیں مرے ساتھ نہ آئیں
مجھے اس پار اترنے میں سہولت رہے گی
شجر جاں سے بس اک بار اڑانے کی ہے دیر
ان پرندوں کو کہاں میری ضرورت رہے گی
اک تسلسل سے میں لو دیتا رہوں گا دن رات
روشنی مجھ سے عبارت ہے، عبارت رہے گی
جب تک آتا نہیں خاموش سفر سے واپس
میری آواز ترے پاس امانت رہے گی
کیسی خاموشی سے آواز دروں ٹوٹ گئی
میں سمجھتا تھا یہ زنجیر سلامت رہے گی
مجھے آلے کہ مری حد نظر کو جا لے
ایک شخص ایسا ہے جس کو یہ رعایت رہے گی

شاہین عباس

یہ طرز خود آرائی ہے لافانی ہماری
آئینے کی حیرانی ہے حیرانی ہماری

اس دشت میں درکار تھا اسباب سفر اور
بے کار گئی بے سرو سامانی ہماری

خوشبو کے سوا کوئی ہمیں جانتا کب تھا
اک پھول کو سونپی گئی نگرانی ہماری

کشتی میں تھے اور مشورے دیتے رہے کیا کیا
دریا نے مگر ایک نہیں مانی ہماری

یہ شام ہمیں دیکھتی ہے اپنا سمجھ کر
اس خواب پہ واجب ہے نگہبانی ہماری

یہ ہونے نہ ہونے کی سزا ٹل گئی آخر
یوں بانٹ لی مٹی نے پریشانی ہماری

کسی آئینے پہ میں پھر نظر نہیں کر سکا
ترے بعد کوئی بھی عشق اثر نہیں کر سکا

اسے خاک پر سے گذرنا کتنا محال ہے
ترے خواب پر جو گذر بسر نہیں کر سکا

میں پلٹ کے آیا تو باغ خالی ملا مجھے
مرا انتظار کوئی شجر نہیں کر سکا

شب ہجر جیسی رواں تھی ویسی رواں رہی
میں کوئی بھی لہر ادھر ادھر نہیں کر سکا

کوئی تم سے دور بھی تھا تمھارے حضور بھی
مگر اس طرح کہ تمھیں خبر نہیں کر سکا

مجھے موج میں بھی مقیم ہونا ہے ایک دن
کئی کام ہیں میں جو موج پر نہیں کر سکا

عجب انتشار سخن میں تھا ترے روبرو
سو میں اپنی بات کو مختصر نہیں کر سکا

مجھے سوتے جاگتے ایک جیسا ملال ہے
مرا خواب کیوں مجھے معتبر نہیں کر سکا

شفق سوپوری

گھر کیا، سایۂ دیوار و در ہے صحرا
مجنوں کا تو ہر حال میں گھر ہے صحرا
میں اس کو زخموں میں ڈبو کر لکھتا ہوں
مجھ کو غم کے پرندے کا پر ہے صحرا
گرم خیال بگولے بن کر اٹھتے ہیں
میرے لئے گویا میرا سر ہے صحرا
میں نے اکھاڑیں کل ٹیلوں کی سب قبریں
دیکھو آج کی رات برابر ہے صحرا
صحرا میں کیا وحشی غزالاں ہوتے ہیں
شہر سے تو حد درجہ بہتر ہے صحرا
دور تلک ہیں دھند کے خیموں کے مہتاب
ویرانی میں کیا خوش منظر ہے صحرا
خاک سے ایک مکان شفق نے بنوایا
صحن میں جس کے جنگل، چھت پر ہے صحرا

دولت خاک ہی دل کے امیروں کی ہے، ہو
سانسوں میں زنجیر اسیروں کی ہے، ہو

نغمے کی ہو نوبت یا نوحے کی جھنکار
ایک صدا بس تیرے فقیروں کی ہے، ہو

مال نفس جب تک ہے محفوظ قضا سے
لو، خیرات فنا کے پیروں کی ہے، ہو

میں زخموں میں انگلی ڈبو کر لکھتا ہوں
کیسی کرامات ترے تیروں کی ہے، ہو

تیرے نام سے ہی پر معنی ہے ورنہ
دل کہ عبارت چند لکیروں کی ہے، ہو

دل سے باہر جتنی بھی دنیا ہے شفق
شاہوں کی ہے اور وزیروں کی ہے، ہو

علی محمد فرشی

ہرا سمندر
دل کے اندر
باہر تو ویرانی
بول مری مچھلی کتنا پانی
اور کتنی گہرائی
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی
پانی میں
تو نے کتنی کالک دیکھی
اور کتنی رشنائی (۱)
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی
ساون میں
تو نے پیاسے پانی کی
کیسے پیاس بجھائی
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی
دریا میں
کیسے توڑ نبھائی
تو نے نیچوں (۲) سے اشنائی (۳)
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی
ریلے میں
ست رنگے چیتر میلے میں
کیسے مشک چھپائی تو
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

بول مری مچھلی
ریگ سمندر
رقص قلندر
کیسے بنجر چھاتی سے
پھوٹ پڑی سچائی
میں تو اپنے اندر جھانک کے
رات بہت شرمائی

---

(۱) روشنائی (۲) پست مرتبہ لوگ (۳) آشنائی

رفیق راز

کون جانے شام کو گذرے گی کیا بازار پر
رونقیں نازل نہ ہوں گی بھیڑ کے اصرار پر

شعلۂ سفاک بھڑکا تھا بھڑکتے ہی بجھا
اک چراغاں سا ہوا تھا سانس کی دیوار پر

ایڑیوں سے دشت کو دریا بنا کر چل دیا
بھید ریگستاں نے کھولے لشکر جرار پر

شور کا سیلاب تھا سب کچھ بہا کے لے گیا
ہوگئی قرباں معطر خامشی گفتار پر

فقر کی دولت سے مالا مال ہیں اللہ ہو
ہم نظر رکھتے نہیں دنیا درم دینار پر

بر سر پیکار سایوں سے تھے اندر سب مکیں
اور باہر دھوپ پھیلی تھی در و دیوار پر

راز کرتا ہے زبان خامشی سے تو عیاں
صوفیوں کا رنگ چھایا ہے ترے اظہار پر

ڈر ہے کہ لگ نہ جائے مرے ہی مکاں میں آگ
بھڑکی ہوئی ہے آج تو خوب آسماں میں آگ

ظاہر ارادہ اونچی اڑانوں کا کر دیا
طائر نے خود لگائی خس آشیاں میں آگ

ہر سمت بارشوں میں کھلے سرخ رو گلاب
برسات ہے لگی ہے ترے گلستاں میں آگ

جھرنے خموشیوں کے تھے دونوں طرف رواں
اور رقص کر رہی تھی کہیں درمیاں میں آگ

ورد زباں درود براہیم ہے تو پھر
ٹھنڈی رہے گی میرے لئے ہر زماں میں آگ

ایک صحرا ہے مری آنکھ میں حیرانی کا
میرے اندر تو مگر شور ہے طغیانی کا

کوئی درویش خدا مست ابھی شہر میں ہے
نقش باقی ہے ابھی دشت کی ویرانی کا

سانس روکے ہے کھڑی در سے ترے دور ہوا
خاک دل یہ ہے سبب تیری پریشانی کا

ہم فقیروں کا توکل ہی تو سرمایہ ہے
شکوہ کس منہ سے کریں بے سروسامانی کا

دل کے بازار میں ہلچل سی مچا دی اس نے
مجھ کو بھی دھوکا ہوا یوسف لاثانی کا

دیکھتا ہوں میں ابھی خواب اسی کے شب و روز
یہ خلاصہ ہے مرے قصۂ طولانی کا

محمد عاصم بٹ

ابھی پو نہیں پھٹی تھی۔ آسمان میں ستارے جگر جگر چمک رہے تھے۔ اندرون شہر کوچہ چھاپہ گراں کی ایک گلی میں پندرہ سولہ برس کے نوجوان نذیر نے ہتھیلیوں سے منہ کے آگے بھونپو بنایا اور بلند آواز میں پکارا ''اچھو اوئے''۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز یوں گونجی جیسے خالی برتن میں سکہ کھنکنایا ہو۔

ماضی کا یہ منظر نذیر کو ہمیشہ یاد رہا اور یہ آواز اب بھی اس کی یادداشت کے گنبدوں میں گونجتی ہے۔ لیکن اب اسے لگتا وہ اچھو کو نہیں، اچھوا سے پکار رہا تھا۔

اس نے ہاتھ پھیر کر قمیص کے نیچے پیٹ سے بندھے ہولسٹر اور اس میں لگے پستول کو چھو کر اطمینان کر لیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا اور جلد سے جلد سوتر منڈی چوک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اسے علم تھا کہ کوبے بدمعاش کا چھوٹا بیٹا روزانہ شام کو اپنے اڈے پر جب قمار بازوں کا خوب رش ہوتا ہے چند گھنٹے ضرور بیٹھتا ہے۔

پچھلا ایک سال اس نے سرحد پار جہاد کی ہنگامہ خیزیوں اور سخت ترین حالات میں گذارا تھا۔ کتنے ہی کافر اس کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچے اسے تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں تھی۔ لیکن ان سب کے چہرے اسے صاف یاد تھے جن کی چھاتیوں میں اس نے اپنی بندوق سے گولیاں اتاری تھیں۔ کیسی تسکین محسوس ہوتی ہے انسان کو جب وہ کسی ایسے شخص کو مارے جس سے انتقام لینے کا اس نے برسوں خواب دیکھا ہو۔ وہ اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کر کے لوٹا تھا۔

لیکن اس تجربے کے نتیجے میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور بموں کے پھٹنے کے دھماکے جیسے مستقل طور پر اس کے کانوں کی اندرونی پرتوں میں سما گئے تھے۔ اور خاص طور پر ان لمحوں میں خوب زور سے اس کے دماغ میں گونجنے لگتے جب کسی باعث رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ اس وقت بھی اس کا دماغ اس شور سے جھنجھنا رہا تھا۔

اسے یاد تھا روزانہ آواز دینے کے بعد وہ سامنے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا لیتا اور کرکٹ کی گیند ہاتھوں میں جھلاتا۔ کبھی دائیں ہاتھ سے بائیں میں، اور کبھی بائیں سے دائیں میں۔ حتیٰ کہ اچھو کی ماں چھت سے نماز پڑھنے اترتی تو وضو کرنے سے پہلے چھجے سے جھانکتی۔ اسے دیکھ کر وہ خاموشی سے مڑتا اور چلتا ہوا گلی کی نکڑ پر درزیوں کے تھڑے پر بیٹھ کر اچھو کی راہ تکتا۔ انتظار سے اسے ہمیشہ کوفت ہوتی لیکن روزانہ یہ کوفت اٹھائے بغیر نہ بنتی۔

دیر بعد پانی کے چھینٹوں سے بھیگے چہرے کے ساتھ اچھو نیم خوابیدہ نیم بیدار سا آتا۔ ''تو آپ ہی کیوں نہیں اٹھ جاتا، نواب صاب۔'' وہ خفا ہوتے ہوئے کہتا۔ اچھو ڈھٹائی سے ہنستا۔

''میں نہیں تیرا انتظار کرتا، روز شاہی مسجد کے باہر بارہ دری میں جب تو نماز پڑھنے جاتا ہے؟''

''تو کون کہتا ہے تجھے انتظار کرنے کو۔ میرے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟'' روزانہ وہ اسے نماز کی تلقین کرتا۔ لیکن وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔

''نماز پڑھنے کے لیے بندے کو پاک صاف ہونا پڑتا ہے، پاگلا۔''

نذیر چپ جاتا۔ ''تو نہاتا کیوں نہیں تو؟''

''تو بھی جھلا ہے مولبی۔ نہاتے ہوئے زیادہ خطرہ ہوتا ہے ناپاک ہونے کا۔ اب یہ مت کہنا کہ ہاتھ پیچھے باندھ کر نہایا کر۔'' نذیر جھنجلا کر سر جھٹکتا اور چل پڑتا۔

روزانہ منٹو پارک جا کر وہ نیٹ پریکٹس کرتے۔ اچھو بالر تھا اور نذیر بلے باز۔ دونوں اچھے کھلاڑی تھے تبھی تو امتحانات میں فیل یا اکثر رعایتی نمبروں سے پاس ہونے کے باوجود اسکول والے انہیں ہر سال اگلے درجے میں ترقی دے دیتے اور یوں وہ دسویں جماعت میں آ گئے تھے۔

نذیر نے ایک جگہ رک کر سبیل کے نلکے سے منہ لگا کر پانی پیا اور چند چھینٹے چہرے پر مار کر گیلے ہاتھ داڑھی اور اپنی فوجی ٹوپی سے باہر کندھے پر جھولتی زلفوں پر پھیرے۔

چوک جھنڈے خان سے گذرتے ہوئے اسے اچھو کے ٹولے کا ایک لڑکا ملا جو آٹے کی چکی کے باہر لکڑی کے بڑے تختے پر اکیلا بیٹھا تھا جہاں سال ایک پہلے تک جب اچھو گرفتار نہیں ہوا تھا، کیسی منڈلی جمتی تھی جس کا دولہا اچھو ہوتا۔

''بس بھورا سا نشانہ چوک گیا مولبی صاب، نہیں تو کوبے کا دوسرا بیٹا بھی پھڑک جاتا۔ اس نے تو استاد کو دیکھتے ہی دھڑ کی لگا دی تھی۔ میں نے مولبی

صاب بڑا سمجھایا استاد کو کہ علاقہ غیر چلا جائے۔ پر اس کی ایک ضد تھی کہ چھوٹے کو مار لوں تو پھر جاؤں گا۔ وہ مرے گا تو میرا انتقام پورا ہوگا۔ میری ماں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔ جب تک استاد پکڑا نہیں گیا وہ بھی غائب رہا۔ اب بڑا اکڑ کر پھرتا ہے۔ اسی نے استاد کو پکڑوایا تھا۔ پولیس تو ان کی پالتو ہے، کسے نہیں پتہ یہاں۔''

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ''اب تو وہ بھی ہمیں آ کر تڑیاں لگاتے ہیں جو استاد کے ہوتے ہوئے کسکتے نہیں تھے۔ استاد جیسا جوان پھر نہیں جنا کسی ماں نے یہاں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اچھو کا باپ رکشا ڈرائیور تھا۔ شریف مگر جثے کا مضبوط اور مزاج کا غصیلا۔ بس کسی بات پر اس کی کوبے سے، جو سوتر منڈی میں جوئے اور نشے کے اڈے چلاتا تھا اور جس کا پولیس اور ہائی جنتری میں بڑا اثر و رسوخ تھا، اڑ پھس ہو گئی۔ غصے میں اس نے کوبے کے کارندے کو چھینٹی بھی لگائی جس کا بدلہ کوبے نے اس کی جان لے کر لیا۔ ایک رات جب وہ رکشا کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے گھر لوٹ رہا تھا اس نے اپنے کچھ بندوں کے ساتھ اسے مسجد مائی لاڈو کے پچھواڑے میں روکا اور دھروتا ہوا اپنے علاقے میں لے آیا پھر چھرے سے اس کا پیٹ چیر ڈالا۔ قتل سر عام ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ پولیس کو کوئی گواہی ایسی نہیں ملی جو مقتول کے لواحقین کی طرف کوبے پر لگائے گئے قتل کے الزام کو ثابت کرتی۔ عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا۔

ایک مدت تک اس واقعے کی دہشت علاقے میں سڑے ہوئے گوشت کی بو کی طرح پھیلی رہی۔ لیکن پھر جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے لوگ رفتہ رفتہ اسے بھول گئے۔ واقعہ عوامی یادداشت میں ضرور باقی رہا لیکن ایک ایسے دور دراز خطرے کی مانند جس کی زد سے وہ سب باہر تھے، ایسا سانپ جس کے دانت سے زہر نکال لیا گیا ہو۔ لیکن اچھو کی ماں کی یادداشت میں یہ سانپ بس سے بھرا اور ہمیشہ پھن پھیلائے پھنکارتا رہا۔ اس زہر کو، جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کا ہر پل بسر کیا، اس نے دھیرے دھیرے اپنے بیٹے میں منتقل کیا۔ جیسے کبھی وش کنیائیں تیار کی جاتی تھیں کہ جن کی سانسوں میں بھی زہر اتر آتا تھا۔ ایسا ہی وہ اپنے بیٹے کو بنانا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتاتی ''سوتر منڈی میں ہے تیرے باپ کا قاتل۔ کیسا دندناتا پھرتا ہے، کسی سانڈ کی طرح! سب نے اسے قتل کرتے دیکھا پر کوئی اس کے خلاف نہیں بولا۔ خدا نے اس کی رسی ڈھیلی کی ہوئی ہے۔ پر ایک دن میرا بھی آئے گا۔ کوئی مائی کا لال اٹھے گا، اس سے بدلہ لے گا۔ ایک ایک ظلم کا، خون کی ایک ایک بوند کا جو تیرے باپ کے جسم سے نکلی۔ تب میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے گی۔''

اس کی ماں غصے میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پاتی اور چھاتی پر دو ہتڑ مارتی۔ اور پھر جب خاوند کی کٹی پھٹی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تو دھاڑیں مار کر روتی اور دیر تک اپنے آپ میں نہ رہتی۔ وہ اس کی باتوں کو کچھ کچھ سمجھنے اور کچھ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سنتا۔ یہ باتیں اسے دلچسپ معلوم ہوتیں جیسے کسی فلم کے ڈائیلاگ ہوتے ہیں۔

''تو لینا بدلہ پتر۔ اپنے مظلوم باپ کی موت کا۔'' اچھو کوئی جواب نہ دیتا۔ بس ٹکر ٹکر اسے تکتا۔

لیکن پھر اس عمر میں جب باتیں کسی کے سمجھائے بغیر خود بخود کچی پکی سی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ٹھوڑی اور گالوں پر بالوں کی اولین فصل نمودار ہوتی اور نرخرے میں ایک گٹھلی سی آگے کو نکل کر آواز میں مردانہ کھردراہٹ پیدا کر دیتی ہے، اسے ماں کی باتوں میں موجود نفرت کی حدت محسوس ہونے لگی۔ یہ حدت اس کے خون میں ابال پیدا کرتی اور خون لپکتا ہوا اوپر دماغ کو چڑھتا۔ وہ سوتر منڈی چوک میں کوبے، جو بڑھاپے کی وجہ سے بے انتہا فربہ ہو کر چوکی پر بیٹھا گوشت کا تودا معلوم ہوتا تھا، اس کے اڈے کے آگے سے گذرتا تو ٹھٹھک جاتا۔ نفرت ایک ایسی چنگاری کی صورت میں اس کی آنکھوں میں بھڑکتی جسے غصے کی ہوا تھپتھپائے تو وہ پورا جنگل جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔

میٹرک کے ابھی امتحان نہیں ہوئے تھے جب دونوں کا انتخاب انڈر سکسٹین سٹی الیون (Under Sixteen City Eleven) میں ہو گیا۔ اطرح سے انھیں صوبائی سطح کے میچوں میں کھیلنے کا موقع ملا۔ لیکن میٹرک کے بعد ان کی دلچسپیوں کے دائرے کچھ یوں بدلے کہ زندگیوں کا نقشہ ہی بدل گیا۔

نذیر 'لشکرِ دین' کے مجاہدوں کے جذبۂ ایمانی سے اتنا متاثر ہوا کہ خود بھی تنظیم کا رکن بن گیا۔ جہاد سے لوٹنے والے مجاہدوں کی روداد اس میں جوش و ولولہ پیدا کرتی۔ کیسے انھوں نے کافروں کے سینوں میں خنجر گھونپے، ان کی چوکیوں اور گاڑیوں کو بموں سے اڑایا اور انھیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہ کہانیاں اس کے سینے میں سانس کی گردش تیز کرتیں اور نفرت کی آگ کو ہوا دیتیں۔

''مسلمان بھائیوں پر ظلم کا انتقام لینا آپ کا فرض ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔ انھیں بھی ویسے ہی تڑپا تڑپا کر ماریں جیسے انھوں نے ہمارے بھائیوں اور بہنوں بیٹیوں کو مارا۔ اور یہ انتقام تو جوان ہی لے سکتے ہیں۔'' اسے تنظیم کے اجتماعات میں بتایا جاتا۔ وہ زیادہ وقت انھی مجاہدوں کے ساتھ گذارتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نیٹ پریکٹس چھوٹ گئی اور جب ایف۔ اے۔ کے داخلے کھلے تو کالج میں فارم جمع کروانے کے بجائے وہ ظفر آباد میں 'لشکرِ دین' کے سالانہ مذہبی اجتماع میں شرکت کے لیے چلا گیا۔ اچھو تعلیم اور کھیل کے میدانوں میں نذیر ہی کی وجہ سے تھا۔ اس نے قطع تعلق کر لیا تو وہ بھی ان سے دست کش ہو گیا۔

سالانہ اجتماع کے موقع پر 'لشکرِ دین' کے سربراہ مولانا شوکت علی خان کا ایمان افروز اور پر جوش خطبہ نذیر کو یاد تھا۔ مولانا نے کہا تھا:

''نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ تن من دھن کی بازی لگانے اور اپنی جانیں قربان کر کے شہادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی ہمارا مذہبی فریضہ بھی۔''

اس بات نے اس کے ذہن پر وہی عمل کیا جو رنگ کاٹ کپڑے پر کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک قطعی نیا رنگ اس پر چڑھا۔ کافروں کے خلاف نفرت کی ایسی جوالا مکھی اس کے اندر بھڑکی کہ اس نے اپنا نام مجاہد بننے کے خواہش مندوں کی

ست میں لکھوادیا۔

اجتماع ہفتہ بھر جاری رہا۔ پھر وہ عسکری تربیت کے کیمپ میں شامل لیا۔ کوئی تین ایک ماہ بعد گھر لوٹا تو اس کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ اس نے داڑھی ھالی تھی، سر پر بندھے سفید صافے میں سے بالوں کی لٹیں گردن پر جھول رہی ہیں۔ لیکن اسے وہ حیرت اور بے بسی کبھی نہیں بھولی جو اپنی زندگی جہاد کے لیے ف کرنے کا فیصلہ سنانے پر اس نے اپنے باپ کے چہرے پر دیکھی تھی۔ وہ تو جیسے پ کا چپ رہ گیا۔ نہ اتنا حوصلہ تھا کہ اپنے ایک ہی بیٹے کو جہاد اور شہادت ے راستے پر چلنے کی اجازت دے جس سے زندہ واپسی کا امکان کم تھا اور نہ اسے کنے کا کوئی جواز تھا کہ یہی تربیت اسے دیتا رہا تھا۔ ماں نے سنا تو سر پیٹ لیا۔

''مسلمانوں کے گلے کاٹے جا رہے ہیں۔ مسلمان ماؤں، بہنوں، یوں کی عزت تار تار کی جاتی ہے۔ کیا ہمیں بے غیرتوں کی طرح تماشا دیکھنا ہے؟ چوڑیاں پہن کر بیٹھے رہیں؟'' اس نے اچھو کے سمجھانے پر طیش میں آتے ے کہا تھا۔ ''یہ وقت باتوں کا نہیں۔ بندوق اٹھانے کا ہے۔ ہمیں طاقت کا اب طاقت سے دینا ہوگا۔ مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی خبریں پڑھ کر میرا خون ھولتا ہے اور بدلے کی آگ جلاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے ان کے ھانے اتاروں۔ تبھی میرے اندر کی آگ بجھے گی۔ میں اب تک گمراہی کی زندگی لذار رہا تھا۔ مولانا شوکت علی خان نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کچھ ٹریننگ ق ہے۔ میں نے اپنی وصیت بھی ہیڈ کوارٹر میں جمع کروادی ہے۔ خدا سے عہد کر لیا ہے۔ یہی میرا جینا مرنا ہے۔''

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نذیر چھ ماہ کی آخری ٹریننگ کے لیے ل آباد چلا گیا جہاں سے اس کی سرحد پار جہاد کے لیے لانچنگ ہونی تھی۔

لیکن یہ انقلاب نذیر کی زندگی میں ہی نہیں آیا، اچھو بھی اس کی زد سے ں بچ سکا۔ کچھ عرصہ تو وہ اپنے چچا کی دکان پر بیٹھ کر ٹیلرنگ کا کام سیکھنے کی کوشش رتا رہا لیکن یہ کام اس متلون مزاج کے موافق نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے بیزار ہو کر ان پر جانا ترک کر دیا۔ اب وہ سارا دن چڑی ماراں گلی میں اپنے ایک دوست ے ویڈیو سنٹر پر بیٹھ کر گذارتا۔ ماں دایہ گیری کا کام کرتی تھی۔ چچا بھی ماہ بہ ماہ خبر یری کرتا۔ گھر کا خرچ اس کے باوجود کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، ٹھیک چل ہا تھا۔ الٹا ماں اسے جیب خرچ دیتی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرنم آواز ں کہتی، ''خدا نے تیری صورت میں مجھے ایک مضبوط بازو دیا ہے تا کہ میں تیرے پ کے قاتلوں سے بدلہ لے سکوں۔''

ویڈیو سنٹر کے :۔ ابر کیرم بورڈ سنٹر میں ہر گیم پر پیسے لگتے تھے۔ ایک بار یتنے اور ہارنے والی پارٹیوں میں دھینگا مشتی ہوئی تو اس نے جا کر بیچ بچاؤ کرایا اور کا مار کر زیادتی کرنے والی پارٹی کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر تو وہ وہیں کر بیٹھنے لگا۔ طبیعت کا اتھرا تو تھا ہی، اس پر فراغت نے جسم میں پھیلاؤ پیدا کیا تو ں کے کڑکے میں دم خم پیدا ہوا اور وہ علاقے کا چھوٹا موٹا 'دادا' بن گیا۔ کیرم بورڈ نٹر پر جیتنے والی پارٹی کچھ پیسے اس کی جیب میں بھی ڈال دیتی، اس اعتماد پر کہ اس سے امن و امان قائم رہے گا۔ یہ کٹوتی کسی کو نہیں بری لگتی۔ یوں اس کی آمدنی کا ایک ذریعہ بن گیا۔ یہ کام آسان بھی تھا اور اس کے مزاج کے عین مطابق بھی۔ یہ ایسا بدمعاشی کا کام تھا کہ جس میں بدمعاشی کرنی نہیں پڑتی، بس ایسا بن کر دکھانا پڑتا ہے۔ اور اگر بدمعاشی کرنی بھی پڑے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ ابتدائی چند ایک چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد اس کا جھاکا کھل گیا تھا اور ہاتھ بات بات پر دوسرے کے گریبان پر لپکتا۔ سو یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کا اٹھنا بیٹھنا، بات کرنا اور لباس سب ایک خاص رنگ میں ڈھل گیا۔ کیرم بورڈ سنٹر پر اس نے اپنا ایک لڑکا بٹھا دیا۔ وہ خود زیادہ وقت چوک جھنڈے میں، جس سے آگے کوبے کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا، آٹے کی چکی کے باہر لکڑی کے بڑے تختے پر بیٹھا دکھائی دیتا۔ علاقے کے چھوٹے موٹے کن مٹے اسے گھیرے رہتے۔

نذیر کو گوریلا ٹریننگ پر گئے چند ماہ ہوئے تھے جب یہ واقعہ ہوا۔ ایک روز سوتر منڈی چوک میں کوبے قصائی کے بیٹے سے اچھو کی تو تو میں میں ہوئی۔ یوں تو دونوں پارٹیاں کسی نہ کسی بات پر سینگ پھنسا ہی لیتی تھیں لیکن لوگ درمیان میں آ کر بیچ بچاؤ کرا دیتے۔ اس بار بات بڑھ گئی۔ دونوں طرف سے ریوالور اور چاقو نکل آئے تو علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ خوب فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں اچھو کا ایک لڑکا زخمی ہوا۔ وہ سب بمشکل وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگے اور انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ کوبے نے اچھو کے خلاف عمدہ قتل کا مقدمہ درج کروایا تھا۔ پولیس اس کے گھر آئی اور اس کے چچا کو پکڑ کر لے گئی۔ کئی دن اس شریف آدمی کو حوالات میں رکھا۔ تاہم جس واقعے نے اسے اپنی خفیہ پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کیا وہ کوبے کے چھوٹے بیٹے کی اس کی ماں سے زیادتی سے متعلق تھا۔ جانے اس نے کیا کہا ہوگا کہ عورت نے جواب میں سر بازار اسے جھانپڑ رسید کیا۔ آپے سے باہر ہو کر اس نے عورت کو دھکا دے کر ادیا اور خوب زدوکوب کی۔

اس واقعے سے کوئی دو ایک ہفتے بعد ایک رات کوبا اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ اڈے میں بیٹھا تھا کہ اچھو نے اپنے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار، چادر میں سر منہ لپیٹے، وہاں پہنچ کر انھیں للکارا اور بغل میں سے پستول نکال کر فائر کیا۔ ایک ایک گولی کوبے اور اس کے بڑے بیٹے کا کام تمام کر گئی۔ چھوٹا صاف بچ گیا اور تھڑے سے کود کر پچھلی گلی میں فرار ہو گیا۔ ساری کارروائی آناً فاناً ہوئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ لوگ جائے واردات پر جمع ہوتے، یہ دونوں موٹر سائیکل دوڑاتے اندرون شہر کی پر پیچ گلیوں میں فرار ہو گئے۔ اس بار اس کے باوجود کہ قاتل نے چادر میں سر منہ لپیٹا ہوا تھا پولیس کو ایک سے زیادہ لوگوں کی گواہیاں مل گئیں جنھوں نے اچھو کو پہچان لیا تھا۔ کوبا علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے قاتل کا پولیس کے ہاتھوں سے بچ نکلنا ڈیپارٹمنٹ کے لئے بڑی سبکی کی بات تھی۔ کوئی ڈیڑھ ایک ماہ کی کاوش بسیار کے بعد آخر پولیس اچھو کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مخبر کی اطلاع پر اس نے بھاری جمعیت کے ساتھ اس مکان کو گھیرے میں لے لیا جہاں اچھو چھپا ہوا تھا۔ اچھو نے قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کی،

خود ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ پولیس نے اسے ہتھکڑیاں پہنائیں اور سیدھا تھانے لے جانے کے بجائے دھروتی ہوئی سوتر منڈی چوک میں لائی جہاں سرعام اس کی چھترول کی، پھر پولیس بے دردی سے اسے بازار میں گھسیٹے پھری۔ وہ جہاں جہاں سے گذرے لوگ اکٹھے ہو جاتے اور ہجوم کی صورت میں ساتھ چلتے کہ جیسے سب مل کر اسے اس کے انجام تک پہنچانے جا رہے ہوں۔

اس واقعہ کو سال بھر ہونے کو آیا تھا جب نذیر کے محاذ سے لوٹ آنے کا واقعہ ہوا۔

ایک عرصے سے وہ لاپتہ تھا۔ شروع میں تو اس کی اطلاعیں آتی رہیں، لیکن پھر یکسر خاموشی چھا گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ ایک دن وہ اچانک ہی لوہاری گیٹ میں وارد ہوا تو اس کے والد کے دوست جراح لوما پہلوان نے اسے پہچانا۔

''اوئے تو مولوی قادر کا پتر ہے۔''

پہلوان نے آگے بڑھ کر نذیر کو گلے لگایا۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس تھا اور کاندھے پر بڑا سا تھیلا لٹکائے ہوئے تھا۔

''لا مجھے پکڑا دے۔'' لوما پہلوان عمر میں اس کے باپ سے تھوڑا ہی چھوٹا ہوگا، اس نے زبردستی اس سے تھیلا چھین کر خود اٹھا لیا۔ پھر کچھ اور لوگوں نے بھی اسے پہچانا اور گلے لگے۔ سبھی جانتے تھے کہ ہارڈویئر کی دکان والے مولوی قادر کا بیٹا جہاد پر گیا تھا اور عرصے سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔

''چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔'' لوما پہلوان اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اس سے جہاد کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوال بھی پوچھتا اور آس پاس لوگوں کو اونچی آواز میں اس کے بارے میں باخبر بھی کرتا جاتا۔ دو جوانوں نے جو اس کے گرد اکٹھی ہو جانے والی بھیڑ میں شامل تھے، آگے بڑھ کر اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ یہ بھیڑ پھیلتی گئی حتی کہ اپنے باپ کی دکان اور پھر محلّہ موہلیاں میں اپنے گھر تک پہنچتے پہنچتے یہ بھیڑ ایک ہجوم کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ لوگ اشتیاق اور عقیدت سے آگے ہو ہو کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے اور پھر رشک سے ایک دوسرے سے کہتے ''دھن بھاگ وہ ماں باپ جن کی ایسی اولاد ہو۔''

''یہ تو نے کیا کیا اچھو؟'' اگلے ہی روز سنٹرل جیل جا کر اس نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا تھا۔ اچھو پر دوہرے قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا اور نذیر جانتا تھا کہ فیصلہ دوست کے حق میں نہیں ہوگا۔ اچھو بہت کمزور اور پژمردہ دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پولیس نے اسے خوب زدوکوب کیا تھا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا۔ نذیر کی آنکھوں میں وہ زمانہ گھوم گیا جب وہ بے فکری کے آسمان پر آزاد پنچھیوں کی طرح مسرور اڑتے تھے۔ روزانہ کرکٹ کھیلنے جاتے، ہنسی مذاق کرتے۔

''میں کل ہی لوٹا ہوں۔ تو مجھے تیرے بارے میں پتہ چلا۔''

''تو تو آ گیا۔ شوق پورا ہو گیا تیرا کافروں کو اپنے ہاتھوں مارنے کا مولوی؟'' اچھو نے زخمی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک بڑھ گئی تھی۔

نذیر کو اس کی بات بری لگی لیکن وہ چپ رہا۔ اس نے سوچا یہ کبھی نہ سدھرے گا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے اپنا سوال دہرایا:

''الحمدللہ ہو گیا پورا۔ پر تو نے یہ کیا کیا؟''

''وہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔'' اچھو نے مدھم آواز میں کہا، اور تھکن سے نڈھال ہو کر سلاخوں کو پکڑے پکڑے نیچے بیٹھ گیا۔

''لیکن ابھی ایک تخم باقی ہے کوبے کا۔ ماں کو کیسے منہ دکھاؤں گا؟''

نذیر تادیر وہاں کھڑا اچھو کو نقاہت اور پژمردگی کے ساتھ سلاخوں سے سر ٹکائے بیٹھے دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اچھو کو نیند آ رہی ہو۔ اپنے یار کی حالت زار دیکھ کر نذیر کا دل بھر آیا اور غصے کا کوندا سا اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ وہ باہر آیا۔ اے۔ ایس۔ پی۔ اندرون شہر کا رہنے والا تھا اور اسے جانتا تھا، اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ نذیر مصافحہ کر کے مڑنے لگا تو اے۔ ایس۔ پی۔ بولا:

''آپ مجاہد لوگ ہیں۔ اللہ کے خاص بندے۔ یہ پیشہ ور قاتل ہے۔ ان لوگوں سے آپ کا کیا لینا دینا؟ آپ یہاں نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔''

نذیر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے مڑا اور لوہاری گیٹ کی طرف چل دیا جس سے آگے اسے سوتر منڈی چوک کی سمت ہو لینا تھا ☆☆☆

اردو، سائنس، اور مسلمان

شمس الرحمٰن فاروقی

دیکھتے دیکھتے ہمارے مقبول اور معروف رسالے ''سائنس'' نے سو شمارے پورے کر لئے، اور یہ شمارے گنڈے دار اشاعتوں کے نہیں، بلکہ باقاعدہ اور متواتر اشاعتوں کے ہیں۔ یوں تو کسی زبان کی زندگی میں آٹھ دس برس کچھ معنی نہیں رکھتے، اور کسی تہذیب کی زندگی میں تو یہ مدت اور بھی معمولی اور مختصر ہے، لیکن کسی رسالے کی زندگی میں اتنی مدت بھی بڑا زمانہ ہوتی ہے۔ اور اگر وہ رسالہ اردو زبان کا ہو تو یہ زمانہ اور بھی زیادہ طویل محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر وہ رسالہ اردو کا ''علمی ادبی'' رسالہ نہ ہو جس میں تنقیدی مضامین، افسانے اور منظومات وغیرہ اشاعت پذیر ہوتی ہیں، بلکہ ''سائنسی'' رسالہ ہو، یعنی اس کے مشمولات کا موضوع سائنس اور اس کے براہ راست متعلقات ہوں، تو ایسے رسالے کا وجود ہی میں آنا مستبعد ہے، چہ جائے کہ اس کا شائع ہوتے رہنا اور تقریباً ایک دہائی تک زندہ رہ جانا۔ اور ہمارے رسالے ''سائنس'' کا تو معاملہ یہ بھی ہے کہ اتنے سال گذر جانے کے باوجود اس کے دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ بفضل خدا اضافہ ہی ہوا ہے۔ یعنی اس بات کا پورا امکان ہے کہ جس طرح اس رسالے نے دیکھتے ہی دیکھتے سو شماروں کی خلیج پار کر لی، اسی آب و تاب اور مستعدی سے یہ اگلی صدی کی خلیج بھی پار کر لے گا۔ اس کارنامے کے لئے ہمارے لائق اور محنتی اور خلوص مند مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اور ان کے رفقا کی جتنی بھی تعریف ہو، کم ہے۔

اردو میں ایک سائنسی رسالہ اور بھی ہے، یعنی کونسل برائے سائنسی و صنعتی تحقیق (Council for Scientific and Industrial Research) کا سہ ماہی پرچہ ''سائنس کی دنیا''۔ یہ بھی دلی سے نکلتا ہے، کم قیمت اور خوبصورت ہے۔ جناب محمد خلیل اس کے مدیر ہیں اور اس رسالے کو شائع ہوتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ دونوں رسالے الگ الگ مقصد کے لئے نکل رہے ہیں اور اپنے اپنے مقصد کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ''سائنس کی دنیا'' میں تصویریں اور عام دلچسپی کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں۔ ماہنامہ ''سائنس'' کے مشمولات عام طور پر ذرا زیادہ اختصاص لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجھ سے پوچھا جائے کہ تمھیں ماہنامہ ''سائنس'' (مدیر محمد اسلم پرویز) میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟ تو میں بے کھٹکے کہوں گا کہ اس کے وہ صفحات جو سائنسی سوال و جواب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سوالات کا تنوع، بسا اوقات ان کی ندرت، اور جوابات کا اکثر و بیشتر شافی و باصواب ہونا میرے لئے ان صفحات میں وہی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو ہم عموماً ناول یا سفرنامے سے حاصل کرتے ہیں۔ سوال جواب کے بعد مجھے وہ صفحے پسند آتے ہیں جن میں نوعمر بچوں بچیوں کی تحریریں چھپتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر میری معلومات میں بہت اضافہ تو نہیں ہوتا، لیکن میری امیدوں میں اضافہ ہوتا ہے کہ یہ بچے بچیاں اردو زبان میں سائنسی علوم کی تونگری کا باعث ہوں گے، اور ان کی کوششوں کے باعث سائنسی مزاج، یعنی تعقلاتی فکر کے مزاج کو ہمارے یہاں بڑھنے اور پھیلنے، پھلنے پھولنے میں مدد ملے گی۔ تیسرے نمبر پر وہ تحریریں میرے لئے دلکشی اور حصول معلومات کا سبب بنتی ہیں جو مسائل صحت، پھلوں، ترکاریوں، اور پھولوں کے خواص و فوائد کے بارے میں ہوتی ہیں۔

لیکن اس رسالے میں ایک بات مجھے شروع سے کھٹکتی رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کی زبان بعض اوقات غیر معیاری اور خلاف محاورہ ہوتی ہے۔ اور افسوس کہ یہ بات گھٹنے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے یہاں اردو نثر کا معیار روز بروز (یا روز بروز نہیں تو ماہ بہ ماہ) پست ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ اب ضروری لگتا ہے کہ جناب مدیر تمام مضامین اور مراسلات کو اشاعت سے قبل اس نقطۂ نظر سے بغور دیکھ لیا کریں کہ ان کی زبان معیاری ہے کہ نہیں۔ جہاں جہاں زبان کچھ مخدوش معلوم ہو، وہاں وہ اپنے حق مدیرانہ کا استعمال کر کے زبان درست کر دیں۔ یہ بات تو سب پر ظاہر ہوگی کہ خراب زبان میں لکھی ہوئی باتیں چاہے جتنی ہی سچی اور اہم ہوں، اپنا پورا اثر پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ طبیعیاتی سائنسوں (Physical Sciences) مثلاً جوہری طبیعیات (Nuclear Physics) کوانٹم طبیعیات

(Quantum Physics)، طبیعیاتی کیمیا (Physical Chemistry)، حیاتی میکانکیات (Biomechanics) وغیرہ، اور خالص تعقلاتی علوم، مثلاً ریاضی (Mathematics)، مشاہداتی اور تعقلاتی علوم، مثلاً فلکیات (Astronomy) پر بھی تو مضامین "سائنس" میں چھپتے ہیں، وہ آپ کی توجہ کو کیوں بیدار نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مضامین میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آتے۔ انگریزی میں تو ان موضوعات پر بھلا برا میں کچھ پڑھ لیتا ہوں اور لطف اندوز بھی ہو لیتا ہوں، لیکن وہی باتیں اردو میں لکھی ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ابھی چند دن ہوئے علی گڈھ کے ایک بہت لائق سائنسداں اور اردو کے مصنف ڈاکٹر حبیب احمد انصاری نے اپنی کتاب "منہاج السائنس والاخلاق" مجھے بھیجی۔ میں نے پہلے انھیں مضامین پر نظر ڈالی جو نئی طبیعیات سے متعلق ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جن باتوں کو میں پہلے سے تھوڑا بہت جانتا تھا وہ تو جوں توں کر کے میری سمجھ میں آگئیں (اگر چہ میں دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں انھیں بالکل سمجھ گیا)، لیکن میں جن باتوں کے بارے میں نہیں جانتا، وہاں ڈاکٹر حبیب صاحب کی علمیت میرے کام نہ آئی۔

اب ظاہر ہے کہ اس بات کے تین جواب ممکن ہیں:

(۱) اردو زبان میں وہ صلاحیت نہیں کہ ایسے مضامین کو ادا کر سکے جن کا تعلق نظری (Theoretical) یا ریاضیاتی مسائل سے ہو۔

(۲) لکھنے والے کے ذہن میں وہ مسائل خود ہی ٹھیک سے واضح نہیں ہیں۔

(۳) سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا۔

ممکن ہے کہ تینوں ہی باتیں تھوڑی بہت صحیح ہوں۔ لیکن پہلی بات تو یقیناً پوری طرح صحیح نہیں۔ ہمارے بزرگوں کی اردو زبان میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ نظری سائنس کے مسائل کو بیان کر سکے۔ اور یہ صلاحیت ہماری اردو بھی موجود ہے۔ البتہ ہم لوگوں نے بوجہ عدم استعمال خود کو اس صلاحیت کے لئے نا قابل کر لیا ہے۔ یہ درست ہے کہ جدید طبیعیات اور فلکیات کے میدان میں (اور اب تو حیاتیات، یعنی Biology کے میدان میں بھی) نئی نئی دریافتوں کے باعث نئی نئی اصطلاحات کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ اور کمپیوٹر سائنس کا تو پانچ دہائی پہلے عمومی وجود ہی نہ تھا۔ نئی اصطلاحات کے لئے پرانے نمونے کام نہیں آسکتے۔ لیکن اصطلاحات بنانا کچھ مشکل نہیں۔ انگریزی اصطلاحات بھی بجنسہٖ لکھی جا سکتی ہیں، بلکہ کمپیوٹر کی زیادہ تر اصطلاحات تو دنیا کی ہر زبان میں انگریزی سے براہ راست اٹھالی گئی ہیں۔ لہٰذا معاملہ صرف اصطلاحات کے فقدان کا نہیں، دلچسپی اور انفرادی صلاحیت کے بھی فقدان کا ہے۔

کچھ دن ہوئے ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد نے اپنی نئی پرانی کتابوں کی نمائش کی۔ افسوس کہ ہندستانی اکیڈمی اب کم و بیش پوری طرح "ہندی اکیڈمی" بن گئی ہے (اور اس میں کچھ قصور اردو والوں کا بھی ہے۔ اردو کا ایک پروفیسر ہمیشہ اس کا نائب صدر یا اہم عہدہ دار ہوتا ہے)، لیکن ایک زمانے میں ہندستانی اکیڈمی نے اردو کی بہت عمدہ کتابیں شائع کی تھیں۔ ان میں اکثر اب بازار میں دستیاب نہیں۔ میں اس امید میں وہاں چلا گیا کہ اکیڈمی کی مطبوعات میں سے شاید ایسی کوئی کتاب مجھے وہاں مل جائے جو میرے مطلب کی ہو لیکن جو میرے پاس نہ ہو۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی تو نہ ہوئی لیکن بعض حیرت انگیز انکشافات بھی ہوئے۔

اب سے کوئی پچاس باون برس پہلے (۱۹۴۹) میں گورکھپور میں میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج میں گیارہویں درجے کا طالب علم تھا۔ وہاں اس زمانے میں ایک استاد تھے جن کا نام شیخ جگو تھا۔ وہ شاید کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے ہوں گے، کیوں کہ ان کا تخلص "مائل" بھی ان کے نام کے ساتھ اکثر دکھائی دیتا تھا۔ پرانے وقتوں کے بزرگ تھے، پکا کالا رنگ، منھ پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ، لحیم شحیم، سر پر ٹوپی، بدن پر کچھ تنگ سی شیروانی، چوڑی موری کا پاجامہ۔ کہیں سے بھی وہ کوئی نئے زمانے کے عالم یا سائنسی معاملات میں درک رکھنے والے شخص نہ معلوم ہوتے تھے۔ اس پر طرہ ان کا نام، "شیخ جگو"۔ ہم لوگ ان کو دیکھ کر مسکرا دیا کرتے تھے کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ۔ وہ شاید الہ آباد کے بی۔ اے۔ اور ایل۔ ٹی (B. A., L.T) تھے، آٹھویں نویں دسویں وغیرہ درجوں کو کچھ پڑھاتے تھے۔ کالج چھوڑتے ہی میں نے انھیں یاد سے فراموش کر دیا، اور یقین ہے کہ میری طرح انٹرمیڈیٹ کے سبھی ساتھیوں نے انھیں فراموش کر دیا ہوگا۔

اب ۲۰۰۳ میں ہندستانی اکیڈمی کی نمائش میں کیا دیکھتا ہوں کہ الہ آباد یونیورسٹی کے مشہور زمانہ پروفیسر، ماہر ریاضیات و فلکیات ڈاکٹر گورکھ پرشاد کی ضخیم کتاب (Introduction to Astronomy) کا ایک نہایت سلیس اردو ترجمہ نایاب کتابوں کی قطار میں رکھا ہوا ہے۔ میں کتاب کھولی تو مترجم کا نام دیکھا، "شیخ جگو مائل، بی۔ اے۔، ایل۔ ٹی۔، استاد میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج، گورکھپور۔" تاریخ اشاعت غالباً ۱۹۳۹ تھی۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

آج تو ذرا ڈھونڈ لائیے، وہ الہ آباد کا نہیں، آکسفورڈ یا علی گڈھ یا قاہرہ کا بی۔ اے۔ پاس ہو، لیکن اسے اتنی انگریزی، اتنی اردو، اور اتنی سائنس آتی ہو کہ وہ گورکھ پرشاد کی Introduction to Astronomy نہ سہی، فریڈ ہائل (Fred Hoyle) کی The Frontiers of Astronomy یا اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کی A Brief History of Time کا ترجمہ کر دے۔ میں نے ان کتابوں کے نام اس باعث لئے کہ گورکھ پرشاد کی کتاب خاصی تکنیکی اور فارمولوں، نقشوں سے بھری ہوئی ہے، اور ہاکنگ نے اپنی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ناشر نے مجھ سے کہا کہ ہر مساوات (Equation) پر تمھاری کتاب کی فروخت نصف ہو جائے گی۔ یعنی اگر مساواتوں سے خالی کتاب کی فروخت ایک ہزار نسخے ہوتی تو ایک مساوات درج کرنے پر اس کی فروخت گھٹ کر پانچ سو رہ جائے گی، دو مساواتیں ہوں گی تو فروخت ڈھائی سو ہوگی، وقس علیٰ ہذا۔ لہٰذا ہاکنگ نے اپنی کتاب کو آسان ترین زبان میں لکھا اور

اس میں صرف ایک مساوات درج کی۔ (اب یہ اور بات ہے کہ ہاکنگ کی کتاب مدتوں تک بالا فروخت (Best Seller) رہی، اور آج بھی مل جاتی ہے)۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آج سے ساٹھ برس پہلے ہماری زبان میں سائنسی بیان و مباحث کی صلاحیت تھی، اور ایسے لوگ تھے، جو اس صلاحیت کو بروئے کار لا سکتے تھے، تو یہ آج بھی ممکن ہے۔ شرط صرف محنت، خود اعتمادی، اور زبان اردو سے محبت پیدا کرنے کی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے (اور اردو کے ''دوست صاحبان'' اسے اکثر اٹھاتے بھی ہیں) کہ اردو میں سائنسی کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اسے پڑھے گا کون؟ یہ سوال صرف خلط مبحث پیدا کرتا ہے۔ پڑھنے والا نہ ہوگا تو کتاب کہاں سے آئے گی، یا کتاب نہ ہوگی تو پڑھنے والا کہاں سے آئے گا؟ یہ وہی پہلے مرغی ہوئی کہ انڈا؟ والا سوال ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پڑھنے والے ہیں (ورنہ ''سائنس'' دس سال کیا، دس مہینے بھی نہ چلتا، اور ''سائنس'' کے سوا بھی اردو میں سائنسی رسالے ہیں، مثلاً ''سائنس کی دنیا''، جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ دوسری بات یہ کہ کتاب ہوگی تو پڑھنے والے بھی بہم ہو جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ پڑھنے والے نہ بھی ہوں، لیکن زبان تو ہے۔ ممکن ہے کل کو پڑھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زبان کو متمول بنانا کیا ہمارا فرض نہیں ہے؟ محمد حسین آزاد نے سوا سو برس پہلے کہا تھا کہ اردو میں کچھ نہیں، صرف عشقیہ شاعری ہے۔ یہ بات تب بھی غلط تھی اور اب بھی غلط ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو میں سائنسی ادب کے پڑھنے والے نہیں ہیں وہ ایک پرانے جھوٹ کو سچ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان سے برأت کا اظہار کرنا چاہیئے۔

ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ اردو میں سائنسی ادب کی روایت کوئی دو سو برس پرانی ہے۔ دہلی میں دہلی کالج اور ماسٹر رام چندر اور دوسروں نے سائنسی کتب کے تراجم کئے اور خود بھی کتابیں لکھیں۔ اودھ میں ملا عبدالرحیم نے گورکھپور میں، اور پھر کولکتہ میں، مشرق کے کئی دیگر مترجمین نے اعظم گڈھ اور پٹنہ میں، پھر انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد اور دہلی میں، جامعہ عثمانیہ نے حیدر آباد میں، ہمارے سائنسی ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کئے۔ کام کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہی، لیکن کام ہوتا رہا۔ یہ محض بدنصیبی ہے کہ ہم نے خود کو یقین دلا لیا ہے کہ اردو میں سائنسی ادب نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اردو میں نئے علوم کی تمام اصطلاحوں کے متبادل الفاظ نہیں ہیں، اس لئے ہمیں اردو میں سائنس لکھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ایک منٹ رک کر اس بات پر غور کر لیتے ہیں کہ سائنس اور دیگر علوم پر ہمارے لکھنے والوں کو آسانی سے اصطلاحیں کیوں بہم نہیں پہنچتیں؟

(۱) ظاہر ہے کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم کتابیں اور لغات اور فرہنگیں نہیں دیکھتے۔ بہت سے علوم کی فرہنگیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ چاہے بہت اعلیٰ درجے کی نہ ہوں، کامل و اکمل نہ ہوں، لیکن موجود تو ہیں۔ ان سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ پھر کتنی ہی عمومی لغات ہیں، اختصاصی علوم کی رہنما کتابیں ہیں، جن سے ہم اصطلاحات حاصل کر سکتے ہیں، یا ان کی مدد سے اصطلاحات بنا سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی - اردو لغت، کلیم الدین احمد کی انگریزی - اردو لغت، شان الحق حقی کی آکسفورڈ انگریزی - اردو لغت، اور رحیم کی انگلیسی - فارسی فرہنگ ہمارے سامنے ہیں۔ کلیم الدین احمد کی لغت تو مہنگی ہے، لیکن بقیہ لغات ہزار روپے کے اندر کی ہیں۔ مولوی صاحب کی لغت تو انجمن ترقی اردو نے چھاپی ہے اور بآسانی مل جائے گی۔ دوسری لغات تھوڑی سی کوشش سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان میں سب اصطلاحیں نہ ملیں گی، اور کوئی ضروری نہیں کہ جو اصطلاحیں ان میں مل جائیں آپ ان سے مطمئن بھی ہو جائیں۔ لیکن رہنمائی کا کام تو یہ لغات بیشک انجام دے سکتے ہیں۔

(۲) دوسری وجہ، اور شاید سب سے بڑی وجہ، یہ ہے کہ ہماری زبان میں اشتقاق لفظ کا اصول نہیں ہے، اور لفظ سے لفظ بنانے کی بھی روایت نے ہمارے یہاں کم فروغ پایا۔ یہ دوسری بات افسوس ناک ہے، کیونکہ لفظ سے لفظ بنانے کا رواج پرانی اردو میں بہت تھا، اور غیر رسمی اردو میں اب بھی ایک حد تک ہے، لیکن تحریری اردو میں اب بہت کم ہے۔

اشتقاق لفظ کے اصول سے میری مراد یہ ہے کہ ہر لفظ کی ایک ''اصل''، یعنی Root ہو، اور اس ''اصل'' سے بہت سے لفظ نکلتے ہوں، جیسے کہ جڑ سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ (عربی میں ''جڑ'' کو ''اصل'' کہتے ہیں۔ Root Word کو عربی میں ''مادہ'' کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ سہ حرفی ہوتا ہے۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔) عربی مادوں کے بذات خود معنی ہوتے ہیں، اور ان سے جو لفظ بنتے ہیں وہ بھی بامعنی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مادہ ہے: ح۔س۔ن۔ اس سے کم سے کم حسب ذیل الفاظ بنتے ہیں:

حَسن، بمعنی اچھا/ اچھائی/ نیکی: تاے وحدت کے ساتھ حسنۃ: جمع حَسَنات: واحد مونث، حُسنیٰ: جمع، حُسنات: واحد مذکر، حسنا: جمع

حِسان: اسم مبالغہ، حَسّان: حَسن کی تصغیر، حُسین۔

حُسن، بمعنی اچھائی، خوبصورتی: اسم صفت، حسین: تانیث، حسینہ: جمع، محاسن: اسم تفضیل، احسن۔

اِحسان، بمعنی اچھا/ نیک کام کرنا: اسم فاعل اور اسم مفعول: مُحسِن، مُحسَن: جمع مُحسِنین، مُحسَنین/ مُحسِنات/ مُحسَنات۔

تحسین، بمعنی خوبصورت بنانا/ کرنا، وغیرہ: اسم فاعل اور اسم مفعول: مُحَسِّن، مُحَسَّن۔

استحسان، بمعنی اچھا سمجھنا، وغیرہ: اسم فاعل اور اسم مفعول: مُستحسِن، مُستحسَن۔

وغیرہ۔ لہٰذا عربی میں قاعدے کے مطابق ہر لفظ سے لفظ نکلتے چلے جاتے ہیں اور قاعدوں کی پابندی کرتے ہوئے ہم عربی میں اور بھی لفظ بنا سکتے ہیں۔ اس کی ایک نہایت معمولی مثال لفظ ''حاسب'' ہے جسے ''کمپیوٹر'' کے لئے عربی میں استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں computer کے لغوی معنی ہیں ''

تفریق کرنے والا، حساب کرنے والا''۔ عربوں نے انھیں لغوی معنی کو اختیار کر کے ''حَسَبَ'' کے اسم فاعل ''حاسب'' سے کام چلا لیا۔

انگریزی میں اشتقاق نہیں ہے، لیکن وہاں لفظ سے لفظ بن سکتے ہیں۔ مثلاً مصدر compute (to) میں لاحقہ er- لگا کر computer بنا لیا گیا۔ یا compute میں able لگا کر computable بنا لیا گیا۔ یا اسم میں کوئی لاحقہ لگا کر مصدر بنا لیا گیا، اور اکثر تو مصدر کو سیدھے سیدھے اسم مان لیا گیا۔ ہمارے یہاں یہ قاعدے نہیں ہیں۔ بعض کو ہم اپنا سکتے تھے، لیکن ہم نے ایسا کیا نہیں۔ انگریزی نے ان اصولوں سے بے حد فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمارے یہاں جو امکانات ہیں ان کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں اسم سے مصدر، اور مصدر سے مصدر بنانے کا طریقہ ہے: چلنا/ چلانا/ چلوانا/ چال/ چالو؛ کٹنا/ کاٹنا/ کٹوانا/ کٹانا/ کاٹ؛ ناپ/ ناپنا/ نپوانا/ نپنا/ نپوا؛ وغیرہ۔ لیکن یہ ہر جگہ نہیں چلتا، اور اس طرز کے نئے لفظ بنانے والے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی سے ہمارے یہاں اس طرز پر بعض اصطلاحیں ضرور بنیں، لیکن یہ عمل بہت محدود پیمانے پر ہوا، اور اب شاید بالکل نہیں ہو رہا ہے۔ مثلاً Nation بمعنی ''قوم'' ہے، اور ہم نے Nationalize کے لئے ''قومیانا'' بنا لیا۔ لیکن Power بمعنی ''طاقت، توانائی'' سے انگریزی میں Empower اور Powerize بنے، لیکن ہم نے ''طاقتانا''، یا ''توانیانا'' نہیں بنایا۔ اس وقت ہمارے پاس Empower، Powerize، Empowerment، اور Power Crisis وغیرہ کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔

ہندی والوں نے اس معاملے میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ انھوں نے سنسکرت کی دونوں صفات کو خوب استعمال کیا ہے۔ یعنی ان کے یہاں اشتقاق بھی ہے اور لفظ سے لفظ بنانے کا رواج بھی ہے۔ مثلاً چلنا/ چلانا/ چالک؛ گَورَو/ گَوروانوِت؛ ورگ/ ورگی کرنڑ؛ ہانیہ/ ہانیہ کار/ ہانیہ کارک، وغیرہ۔ ہندی والوں کی یہ قوت نئے لفظوں کی ایجاد میں بہت کام آتی ہے۔ مثلاً Globe کے لئے ان کے یہاں لفظ ہے، ''بھومنڈل''۔ انھوں نے اس سے ''بھومنڈلیہ'' بنایا، بمعنی Global، اور پھر ''بھومنڈلی کرنڑ'' بنا لیا، بمعنی Globalize, Globalization۔ لیکن ہم لوگ ابھی تک ان لفظوں کے لئے کوئی مقبول اصطلاح نہیں بنا سکے ہیں۔

(۳) یہاں سے تیسری بات نکلتی ہے۔ اکثر ہندی والوں کو، اور ساٹھ کی عمر سے زیادہ کے تمام ہندی والوں کو، سنسکرت بخوبی آتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے سنسکرت کے خواص اور الفاظ دونوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہاں معاملہ یہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی اردو والا ایسا ہو جو عربی سے واقف ہو، اور کیا نئے کیا پرانے، اردو کے کم سے کم پچاس فی صدی لوگ فارسی سے بھی ناواقف ہیں۔ لفظ سے لفظ بنانے کے جو محدود طریقے اردو میں موجود ہیں، انھیں استعمال میں لانا برا سمجھا جاتا ہے، اور عربی فارسی ہم جانتے نہیں۔ ایسی صورت میں اصطلاحوں کے میدان میں اردو والے بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ فارسی کی ایک عمدہ مثال دیکھئے: انگریزی کے لفظ Frequency کے لئے ہمارے پاس کوئی اچھا لفظ نہیں ہے۔ فارسی والوں نے اس کے لئے ''بس آمد'' بنایا ہے (وہاں اسے ''بسامد'' لکھتے ہیں)۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لفظ Frequency کے تمام معنوں کے لئے مناسب ہے۔ لیکن ہم فارسی سے نابلد ہیں لہٰذا اس لفظ سے نابلد ہیں۔

لہٰذا اصطلاحیں بنانے میں جو مشکلیں ہمیں پیش آ رہی ہیں ان کی سب سے بڑی وجہ عربی فارسی سے ہماری ناواقفیت ہے۔ دوسری بڑی وجہ اردو کے امکانات سے فائدہ نہ اٹھانے کی ذہنیت ہے۔ لیکن معاملہ شاید صرف اصطلاحوں کے فقدان، یا پڑھنے والوں کی مبینہ کمی، یا اردو کے مبینہ غیر سائنسی مزاج کا نہیں ہے۔ ایک بہت بنیادی معاملہ سائنس اور مذہب کے رشتوں کا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعتقاد اور عقیدے پر ہے، اور سائنس کی بنیاد تعقل اور استدلال پر، لہٰذا دونوں میں ٹکراؤ لازمی ہے۔ مذہب اور سائنس یکجا نہیں ہو سکتے۔ اردو اگرچہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کی تہذیب اور ادب پر مسلمانوں کا گہرا اثر رہا ہے، اور کائنات کے بارے میں جو تصورات اردو کی لسانی تہذیب میں جاری و ساری ہیں، ان میں اسلام اور پھر ہندو مذہب کے بھی مفروضات کا بہت عمل دخل ہے، لہٰذا یہ خیال بھی عام ہو گیا ہے کہ اردو میں سائنس کو فروغ نہیں ہو سکتا۔

مذہب (یعنی وحی، اور اس پر مبنی عقائد) اور فلسفہ (یعنی تعقل اور دانش اور استدلال) کے درمیان ایک خلیج نظر آتی ہے، اس بات کا احساس مسلمان فلاسفہ کو اسی وقت سے ہونے لگا تھا جب مسلمانوں کی تہذیب میں فلسفہ و دانش کا رواج ہوا۔ معتزلہ نے شریعت کے احکام اور وحی پر مبنی عقائد کے بارے میں حکم لگایا کہ یہ خلاف عقل نہیں ہیں۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ مروج عقیدے یا شریعت میں اگر کوئی چیز ایسی ہے جو خلاف عقل ہے، تو وہ اسلامی اصول کے خلاف ہے۔ معتزلہ کی بات چلی نہیں، لیکن ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں نے بعد کے تمام مسلمان مفکرین کو پریشان کیا۔ عقیدے کا تقاضا تھا کہ ہمارے افکار و تفکر کی بنیاد اس عقیدے پر ہو کہ خدا کا وجود ہے۔ لیکن بہت سے ایسے مسائل تھے جن میں خدا کو منہا کئے بغیر کوئی عقلی حل بظاہر ممکن نہ تھا۔ ادھر یہ بھی تھا کہ خدا کی کتاب میں جگہ جگہ انسان کو غور و فکر، تعقل و تدبر، کائنات پر سوچ بچار کی دعوت دی گئی ہے۔ یعنی خدا خود چاہتا ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے۔ لیکن اس باب میں کوئی ہدایت نہیں ملتی کہ اگر تعقل اور دانش کی راہ خدا کے وجود سے انکار کی طرف لے جائے تو انسان کدھر جائے؟

مسلمانوں نے اس مشکل کو حل کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن بظاہر انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ تیرہویں صدی سے اسلامی تہذیب میں سائنس کا زوال شروع ہوتا ہے، اور سترہویں صدی تک آتے آتے سائنس (یعنی فلسفہ بھی، اور خالص سائنسی علوم بھی) اور ٹکنالوجی دونوں ہی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے اسلامی معاشرہ ان چیزوں سے بظاہر خالی ہو جاتا

ہے۔درست کہ مغل عہد کے ہندوستان میں سائنس اور ٹکنالوجی دونوں موجود تھیں، اور اگرچہ انھیں ہندوستان میں اتنا فروغ نہیں ہو رہا تھا جتنا اس زمانے کے یورپ میں ہو رہا تھا، لیکن مغل دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کا عمل دخل خاصا تھا۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ مغل فلسفہ اور سائنس اور ٹکنالوجی پرانی چیزوں کو بہتر بنانے اور انھیں زیادہ موثر یا ذوق انگیز بنانے ہی میں مصروف تھے۔ نئی چیزوں، نئے سوالات، نئے مسائل سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ اکبر کے زمانے میں چھاپہ خانہ یہاں پہنچ چکا تھا۔ لیکن اکبر جیسا بیدار مغز بادشاہ بھی چھاپے خانے کے غیر معمولی امکانات کو نہ دیکھ سکا اور اس نے چھاپے خانے کو قطعی نظر انداز کیا، اس کے فروغ و ترقی کے لئے کوشاں ہونا تو دور کی بات تھی۔ اسی طرح، ہندوستانی ماہرین فلکیات نے روایتی فلکیاتی اور طبیعیاتی مشاہدوں اور نظریات میں مزید گہرائی اور باریکی تو پیدا کی، لیکن کپلر (Kepler) اور گلیلیو (Galileo) کی دریافتوں سے انھوں نے بالکل اعتنا نہ کیا، حالانکہ اس کا امکان ہے کہ وہ ان سے واقف رہے ہوں۔

مسلمانوں میں سائنس کے زوال کا ذمہ دار عموماً امام غزالی کی تعلیمات کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ امام غزالی کی تعلیمات کو بہت سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

فلسفیانہ حقائق اور الٰہیاتی حقائق کے مابین تطابق نہیں ہوسکتا، اور جہاں فلسفیانہ حقائق اور الٰہیاتی حقائق کے درمیان تصادم یا تضاد نظر آئے، وہاں فلسفیانہ حقائق کو پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔ اللہ نے انسان کو عقل دی ہے، اگر وہ اس کا صحیح استعمال کرے تو اس پر وحی الٰہی اور پیام رسالت پناہی کی سچائی کھل جائے گی اور وہ روحانی بلندی یعنی عرفان حقانی حاصل کرلے گا، کہ یہی مقتضائے تخلیق آدم ہے۔ پھر کائنات بھی اس کے قدموں میں ہوگی۔

امام غزالی کا جواب ان کے کوئی دو سو برس بعد ابن رشد نے تفصیل سے لکھا اور اپنی حد تک اس نے ثابت کر دیا کہ فلسفے کی راہ گمراہی کی راہ نہیں، بلکہ علم وحقیقت کی راہ ہے۔ ابن رشد نے کہا کہ الٰہیاتی حقائق اور دانشورانہ، فلسفیانہ (یعنی سائنسی) حقائق میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ وہ حق کے دو مختلف مدارج کو پیش کرتے ہیں۔ ایک کے سچ ہونے سے دوسرے کا باطل ہونا لازم نہیں آتا۔ دو الگ الگ حقیقتیں ہیں، اور دونوں میں بقائے باہمی ممکن ہے۔ قرآن بیک وقت غیر مخلوق اور اللہ کا براہ راست کلام بھی ہے، اور

انسانوں کی دنیا میں ایک صحیفہ بھی ہے جس کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح کسی بھی متن کا مطالعہ ہم کرتے ہیں۔ ظاہری علما کا کہنا تھا کہ قرآن میں کوئی مخفی معنی نہیں، جو ہے وہ سامنے ہے۔ باطنی علما کا کہنا تھا کہ قرآن کے اندر بھی قرآن ہے، یعنی قرآن کے اندر ایک باطنی معنی بھی ہیں۔ ابن رشد کے فلسفے کے مطابق ظاہریوں اور باطنیوں میں اختلاف سے قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ابن رشد کا حل تھا تو بہت دلکش، لیکن اسے مقبولیت نہ حاصل ہوئی۔ جدید سائنسی فکر کی روشنی میں دیکھیں تو ابن رشد کے استدلال میں ایک بڑا نقص بھی تھا، کہ اس کے خیال میں کچھ حقائق (سائنسی حقائق) ایسے تھے جن کا وجود معروضی طور پر ثابت تھا، یعنی کچھ حقائق کا وجود کسی مشاہد پر مبنی نہیں تھا، اور نہ ان کی نوعیت پر کسی قسم کا شک ہوسکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حقائق خارجی کائنات میں اس طرح موجود ہیں کہ وہ بس ہیں (They are out there)، انھیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، عقل ان کا وجود ثابت کرسکتی ہے۔ لیکن ابن رشد کے برخلاف، جدید سائنسی فکر کو سائنس کے بارے میں ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ جدید سائنس جانتی ہے کہ جتنے بھی ''حقائق'' ہیں، ان کا ''حق'' یا ''حقیقت'' ہونا کسی نہ کسی معنی میں اضافی ہے۔ اور بہت سی اشیا کے بیان میں ہمیں قطعیت نہیں حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جدید سائنسی فکر کی رو سے ابن رشد کا حل ادھورا اور غیر تشفی بخش ہے۔

آج کے زمانے میں بعض مسلمانوں کی فکر میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اللہ کی کتاب میں سب کچھ صحیح لکھا ہے، اور اس کی صحت کو سائنس کے ذریعہ ثابت کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ہم آئے دن ایسی تحریریں دیکھتے ہیں (اور افسوس یہ کہ ان میں سے بعض ہمارے رسالے ''سائنس'' میں بھی چھپتی ہیں) جن میں سائنس کی روشنی میں کسی قرآنی آیت یا حکم کو ''صحیح'' ثابت کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سائنس کی روشنی میں ثابت کرنے کے معنی ہیں قرآن کو سائنس کا محکوم قرار دینا۔ اصل صورت حال تو یہ ہونی چاہیئے کہ سائنس اور قرآن میں کوئی تضاد ہو تو سائنس کو غلط اور قرآن کو درست اور سائنس کو قرآن کا محکوم ٹھہرایا جائے۔ سائنس کے سہارے قرآن کو ''صحیح'' ثابت کرنے کی کوشش کے بارے میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ ایسی کوششیں غلط اور گمراہ کن ہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ قرآن اٹل ہے، اور سائنس بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا آج ہم کسی قرآنی آیت کو سائنس کے کسی نظریے کی رو سے صحیح ثابت کریں، اور سائنس کل بدل جائے، اور سائنس کے جس نظریے کی بنیاد پر آپ نے قرآن کی سچائی ثابت کی تھی، وہ نظریہ خود ہی باطل ٹھہرے، تو پھر آپ کا استدلال کہاں گیا؟ جس سائنسی نظریے کے اعتبار سے آپ نے قرآن کو سچا ٹھہرایا تھا، وہ نظریہ ہی غلط ثابت ہوا، تو پھر نعوذ باللہ قرآن بھی غلط ٹھہرا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ مولانا نے کہا کہ سائنس تو دم بدم بدلتی رہتی ہے، تو پھر آپ کہاں تک اس کی روشنی میں قرآن کی تاویلیں بدلتے رہیں گے؟ سائنس کو اس کے حال پر چھوڑیئے اور قرآن کو اس کا پابند نہ بنائیے۔ سائنس کی جس حقیقت کو آج کے مغربی انسان نے بہت دکھ اٹھا کر حاصل کیا ہے، وہ حقیقت ایک اسلامی مفکر کے سامنے بہت پہلے منکشف ہوچکی تھی۔

اوپر میں نے کہا ہے کہ ابن رشد نے سائنس اور عقیدہ دونوں کو سینے سے لگائے رکھنے کی جو کوشش کی تھی اسے مسلمانوں میں قبولیت نہ حاصل ہوئی۔ اس لئے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو خدائی عقیدہ اور لاخدا سائنس میں سے ایک چیز انتخاب کرنی تھی۔ انھوں نے امام غزالی کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے خدائی عقیدے کو قبول کیا اور سائنس کو لاخدا سمجھ کر مسترد کر دیا۔ لہٰذا بارہویں/تیرہویں صدی میں مسلمانوں میں سائنس کا زوال شروع ہوا، اور سولہویں/سترہویں صدی

میں یہ انحطاط مکمل ہو گیا۔ لیکن کیا یہ بات پوری طرح صحیح ہے کہ مسلمانوں میں سائنس کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عقیدے اور مذہب کو سائنس پر تفوق دیا؟

قبل جدید دنیا میں تین بڑی تہذیبیں تھیں، اور یہ تینوں ہی تہذیبیں سائنس، فلسفہ، اور عقلی کارگذاریوں میں بہت پیش پیش تھیں۔ ایک تو چینی (جس میں جاپانی اور کوریائی کو شامل کر کے ''مشرق بعید'' کی تہذیب کہا جاتا ہے)۔ پھر ہندو، جسے عمومی طور پر ''ہندوستانی'' کہا جاتا ہے، اور پھر سب سے آخر میں اسلامی، جس کے تحرک اور نامیاتی قوت کا سرچشمہ عرب تھا لیکن جس کی تعمیر میں کئی ملکوں اور روایتوں نے حصہ لیا، اور جس پر یونان و مصر نے بھی اثر ڈالا۔ آج کی مغربی سائنس و حکمت جن بنیادوں پر استوار ہے وہ مشرق بعید اور اسلامی تہذیبوں کی فراہم و تعمیر کردہ ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی بھی بہت سی سائنسیں، خاص کر طب و ریاضی، مسلمانوں کے ذریعہ مغرب میں پہنچیں اور انھوں نے بھی وہاں کی سائنس اور علوم عقلیہ کے فروغ میں اپنا کردار نبھایا۔ مسلمانوں نے جس طرح یونان کے علوم کو حاصل کیا، انھیں محفوظ رکھا اور ان پر ترقیاں کیں اور نئے علوم ایجاد کئے، اسی طرح ہندو ریاضی، طب، اور فلکیات کو بھی مسلمانوں نے حاصل اور عام کیا۔ اب اس بات کو کٹر سے کٹر مغرب پرست بھی تسلیم کرتا ہے کہ مشرق بعید اور اسلام کی تہذیبوں نے مغرب کو ترقی کی ساری راہیں دکھائیں، اور نظری و عملی فکر کی وہ بنیادیں فراہم کیں جن پر مغرب نے اپنی عمارت قائم کر سکا۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ہندو علوم کو نقصان پہنچایا۔ تاریخ تو بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد نے انھیں اور بھی استحکام بخشا۔ سنسکرت شعریات اور ہندو فلسفہ کے بہت سے عظیم کارنامے مسلمانوں کے ورود ہند کے بعد وجود میں آئے۔ ہندو فلسفہ اور ہندوستانی سائنس (یعنی سائنس سے متعلق وہ کارگذاریاں اور دریافتیں جو بزبان سنسکرت بیان ہوتی تھیں) ان کو پھلنے پھولنے کے جو مواقع تھے وہ مغلوں کے انحطاط کے بعد مفقود نہیں ہو گئے۔ ہندو فلسفہ شعر میں آخری بڑا کارنامہ عہد شاہجہاں و اورنگ زیب کے پنڈت راج جگن ناتھ کی کتاب ''راس گنگا دھر'' ہے، اور ہندو سائنس کا آخری بڑا کارنامہ عہد اورنگ زیب و محمد شاہ کی وہ رصد گاہیں ہیں جو سوائی راجہ جے سنگھ نے دہلی اور جے پور میں قائم کیں اور جنھیں آج ''جنتر منتر'' کے حقارت بھرے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنتر منتر کا ذکر آیا ہے تو اس سے متعلق ایک دلچسپ بات ابھی کچھ دن ہوئے سامنے آئی ہے اور جس سے میرے اس قول کو مزید استحکام پہنچتا ہے کہ ہندوستانی سائنس اور اسلامی سائنس ہمارے ملک میں لازم و ملزوم تھیں، اور ان کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوا۔ نصیر الدین طوسی نے ۱۲۶۱ میں اپنی کتاب ''تذکرہ فی علم الہیئت'' تصنیف کی۔ پھر اس نے ۱۲۷۴ میں صرف ''تذکرہ'' کے نام سے اس کا ایک نیا اور اضافہ شدہ روپ اپنے شاگردوں کی اعانت سے شائع کیا۔ طوسی نے اس کتاب میں اس بات کا امکان ظاہر کیا کہ زمیں اپنے محور پر سورج کے گرد گھومتی ہے۔ طوسی، اور اس کے ایک شارح ابن الشاطر دمشقی کے خیالات سے کوپرنکس (Copernicus) نے استفادہ کیا، لیکن اس نے ان پر ترقی کر کے یہ بھی کہا کہ زمین نظام شمسی کا حصہ ہے اور اس نظام کا مرکز سورج ہے۔ نظام شمسی کے تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ طوسی کی ایک شرح عبد العلی بن محمد بن حسین البرجندی (al- Birjandi) نے ۱۵۲۰ کے آس پاس لکھی۔ اس شرح میں البرجندی نے طوسی کے متبعین، خاص کر قطب اللہ شیرازی کے خیالات سے بھی بحث کی۔

طوسی کی کتاب کے گیارہویں باب میں بعض ایسے مسائل پیش کئے گئے تھے جنھیں قطب الدین شیرازی، اور پھر کوپرنکس نے استعمال کیا۔ سوائی راجہ جے سنگھ نے ۱۷۲۹ میں طوسی کے ''تذکرہ'' کا یہی گیارھواں باب، اور اس پر البرجندی کی شرح کا سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ سنسکرت مترجم نین سکھ اپادھیائے کو عربی نہیں آتی تھی، لہٰذا ایک مسلمان عالم محمد عابد نے البرجندی کے متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ''ہندی'' (یعنی اردو) میں پنڈت نین سکھ کو سمجھایا اور پنڈت نین سکھ نے اسے معیاری سنسکرت میں منتقل کیا۔ عربی اصطلاحات کے معنی سمجھ کر نین سکھ نے ان کے سنسکرت متبادل لکھے، اور جہاں سنسکرت متبادل نہیں تھے، وہاں انھوں نے سنسکرت متبادل وضع کئے، یا پھر عربی اصطلاح کو ناگری رسم الخط میں لکھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سوائی راجہ جے سنگھ نے البرجندی کے گیارہویں باب ہی کو ترجمے کے لئے منتخب کیا۔ انھیں کوپرنکس کے بارے میں کچھ معلوم نہ رہا ہوگا، ارنہ وہ یہی جانتے رہے ہوں گے کہ البرجندی کے خاص اسی باب کے تصورات و اشکال نے کوپرنکس کو متاثر کیا تھا۔ اگر مغلوں کے زوال کے ساتھ ہندوستانی + اسلامی سائنس کا زوال ہندوستان میں نہ ہو گیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ نین سکھ کے ترجمے کا کوئی طالب علم طوسی، قطب الدین شیرازی، البرجندی، نین سکھ، اور کوپرنکس کے درمیان ربط ڈھونڈ لیتا اور ہماری سائنس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا۔ نین سکھ کا سنسکرت اور البرجندی کا عربی متن اب انگریزی میں ترجمہ ہو کر آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس معاملے کی تفصیلات جامعہ ہمدرد کے رسالے Studies in History of Science and Medicine (مدیر الطاف احمد اعظمی) کے شمارہ نمبر ۲، بابت جولائی - دسمبر، ۲۰۰۲ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ بات قابل لحاظ ہے علوم عقلیہ کی روایت اوائل انیسویں صدی تک دہلی اور اودھ میں ایک حد تک قائم رہی۔ اودھ میں خان علامہ تفضل حسین خان نے لاطینی پڑھی اور نیوٹن کی Principia کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ گورکھپور کے ملا عبد الرحیم نے بھی لاطینی اور انگریزی پڑھی اور اردو فارسی میں علمی کارنامے انجام دیئے۔ لیکن یہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ افسوس کہ اس وقت تک ہماری آنکھیں انگریزی لالٹینوں سے اس درجہ خیرہ ہو چکی تھیں کہ ہم نے اس آخری سنبھالے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

یہ تاریخ کا عجیب واقعہ ہے کہ مشرق بعید اور اسلام کی تہذیبوں میں سائنس اور علوم عقلیہ کا زوال کم و بیش ایک ہی زمانے میں، یعنی سولھویں/سترھویں

صدی سے شروع ہوا۔ ہندوؤں کا زوال تو مغل تہذیب کے زوال سے وابستہ ہے، کیوں کہ مغل دور میں ہندو فلسفہ وفکر کو پھولنے پھلنے کے پورے مواقع میسر تھے۔ لہٰذا معما صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سائنس کا زوال کیوں ہوا؟ معمایہ بھی ہے کہ مشرق بعید میں سائنس کا زوال کیوں ہوا؟ وہاں تو مذہب اور سائنس میں کوئی تصادم نہ تھا، کیونکہ ان کا مذہب (بدھ مذہب اور اس کی مختلف شکلیں) خدا کے تصور سے بیگانہ ہے، لہٰذا وہاں فلسفیانہ اور سائنسی تفتیش میں خدا کو منہا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اور تیسرا معمایہ ہے کہ ان دونوں تہذیبوں میں علوم عقلیہ کا زوال کم و بیش ایک ہی وقت میں کیوں شروع ہوا؟

اس کا آسان جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب کی برتری کا آغاز ہوا تو مشرق کی بالادستی کا بھی اختتام لازمی تھا، یعنی مغرب کی بلندی اور مشرق کی پستی ہم معنی ہیں۔ یا یوں کہیں کہ مغرب کے عروج نے مشرق کا زوال پیدا کیا۔ لیکن یہ جواب غیر منطقی ہے۔ تاریخ یا فلسفہ، یا سائنس کا ایسا کوئی اصول نہیں جس کی رو سے ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں لازم وملزوم کا رشتہ ہو۔ تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں کئی تہذیبیں ایک ساتھ پھل پھول رہی تھیں۔ سب سے نمایاں مثال تین چار سو برس قبل مسیح کے ہندوستان، یونان، اور چین ہیں کہ سب اپنے اپنے طور پر بیک وقت عروج پر تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشرق کا زوال اس وجہ سے ہوا کہ مغرب اس پر غالب آگیا، تو اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ اول تو یہ کہ مشرق بعید کی تہذیبوں پر مغرب کا غلبہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہوا، اور علم و دانش کا زوال، یا زوال نہیں تو ٹھہراؤ اور جمود، یہاں سولھویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ یعنی سولھویں صدی کے بعد چین میں نئے سائنسی اور علمی معاملات کو فروغ نہ ہو سکا۔ دوسری بات یہ کہ مشرق وسطیٰ اور ہندوستان اور افریقہ پر مغرب کا غلبہ ہوا ہی کیوں؟ ایسا تو نہیں ہے کہ غلبہ پہلے ہوا اور زوال بعد میں؟ حقیقت یہی ہے کہ ان اقوام کا زوال ان پر مغرب کے غلبے کے باعث نہیں شروع ہوا۔ ان کے زوال کے باعث ان پر مغرب کا غلبہ ہو سکا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مغرب کی بالادستی قائم ہو جانے کے بعد ان تمام خطوں کے اصل اور روایتی علوم وفنون میں مزید زوال پیدا ہوا، حتیٰ کہ بعض چیزیں (خاص کر روایتی صنعت، حرفت، اور ٹکنالوجی) تو بالکل ناپید ہی ہو گئیں۔

مسلمانوں میں سائنس کے زوال پر مشرقی حلقوں کے باہر شاید زیادہ غور نہیں کیا گیا، لیکن مشرق بعید کے معاملے پر مغرب میں مشہور ماہر سماجیات ماکس ویبر (Max Weber)، اور اس کے بعد کئی مفکرین نے غور کیا، لیکن تشفی بخش جواب کسی سے نہ بن پڑا۔ مثلاً ویبر نے کہا کہ سولھویں صدی سے چین میں قدامت پرست نوکر شاہی (Conservative Bureaucracy) کا حکم چلنے لگا۔ ان لوگوں کا طریقہ ''عملی عقلیت پسندی'' کا تھا۔ اور ان کے زیر اثر ملک میں ''عقلیت پرست مہم جوئی'' (Rationalist Ambition) کا خاتمہ ہو گیا، پہلے سے قائم شدہ چیزوں پر قناعت کر لی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس جواب میں سب سے بڑی کمی ہے کہ اس نے زوال کے اسباب بیان کرنے میں استدلال کو ایک قدم پیچھے دھکیل دیا ہے، اور بس۔ یعنی زوال اس وجہ سے ہوا کہ نوکر شاہی قدامت پسند اور طاقتور تھی۔ لیکن یہی نوکر شاہی پہلے تو روشن خیالی اور ترقی پذیری کی ضامن تھی۔ پھر اسے کیا ہو گیا جو اس نے قدامت پرستی کا جھنڈا اٹھا لیا؟ ماکس ویبر کے یہاں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ بعض دوسرے مفکرین کا کہنا ہے کہ چینیوں نے ''لفظ'' (Word) کی جگہ ''طریق'' (Way) کو اختیار کیا۔ اگر وہ ''لفظ'' کو اختیار کرتے تو اشیا کے پیچھے جو حقائق ہیں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے ''طریق''، یعنی عملی راہ کو اختیار کیا۔ یعنی انھیں اس بات کی فکر نہ تھی کہ ادراکات کی تہ میں جو حقائق ہیں انھیں دریافت کیا جائے۔ ان کی توجہ اس بات پر رہی کہ ان چیزوں کو حاصل اور اختیار کیا جائے جن سے عملی زندگی کو پر امن طریقے سے گذارا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس جواب میں، اور ویبر کے جواب میں کوئی خاص فرق نہیں، اور دونوں ہی جوابات میں یہ کمزوری ہے کہ استدلال ایک درجہ پیچھے دھکیل دیا گیا ہے، اسے اصل آغاز تک نہیں پہنچایا گیا۔ اگر سولھویں صدی میں اہل چین نے ''لفظ'' کو ترک یا اور ''طریق'' کو اختیار کیا، تو سولھویں ہی صدی میں ایسا کیوں ہوا؟ اور ''لفظ'' اور ''طریق'' کی تفریق تو چینی فکر میں کم و بیش روز اول سے تھی۔ پھر اس کے ''خراب'' نتائج سولھویں صدی ہی میں کیوں ظاہر ہوئے؟ ابن خلدون نے قوموں کے عروج اور زوال کا جو فلسفہ بیان کیا تھا، اس کا بنیادی نکتہ کم و بیش یہی تھا کہ قبائلی سماج جب شہری سماج میں بدلتا ہے تو وہ اپنے استحکام اور توسیع کی راہیں ڈھونڈتا ہے، پھر جب اسے مخالفوں، مبارزطلبوں اور رقیبوں کی طرف سے یک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے تو وہ اندرونی امن وسلامتی اور معاشرتی عیش وعشرت کی راہ اختیار کر لیتا ہے، اور وہیں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ابن خلدون کا یہ تہذیبی چرخ (Cultural Cycle) کسی معاشرے میں سائنس اور تعقل کے انحطاط کے لئے الگ سے کوئی وجہ نہیں بیان کرتا۔ اور چین کی تہذیب کو اپنے قبائلی عہد سے نکلے ہوئے کوئی تین ہزار برس ہو چکے تھے جب اس کا زوال شروع ہوا۔

ظاہر ہے کہ مشرق بعید کی تہذیبوں کے عروج و زوال کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے دلچسپ ہے اور شاید سبق آموز بھی، لیکن مسلمانوں میں سائنس کے زوال کی وجہیں کہیں اور ہیں، اور ہمیں ضرور ہے کہ ہم انھیں تلاش کریں اور سمجھیں۔ فی الحال میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ صرف مذہب سے شغف، اور فلسفہ (یعنی علوم عقلی اور سائنس) کا تفحص کر کے لاخدا ہو جانے کا خوف اس زوال کی توجیہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

دوسری بات جسے کہنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سائنس کا زوال تو ہوا ہی، لیکن ابن رشد کے بعد ہمارے یہاں کسی فلسفہ، سائنس کا بھی ارتقا نہ ہوا۔ ملا صدرا نے فلسفے کو مابعد الطبیعیات سے آگے لے جا کر روحانیات، یا ایک طرح کی اشراقیت سے ملا دیا۔ اس طرح انھوں نے ایک مسئلہ تو حل کیا، کہ عقل اور کشف ایک منزل پر ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے دوسرا مسئلہ حل نہیں کیا، بلکہ اسے اور پیچیدہ کر دیا۔ عملی زندگی میں تعقل کا کیا مقام

ہے؟ فلسفے کے حقائق کی نوعیت کیا ہے؟ ان حقائق سے مسائل کا استنباط کر کے ہم عملی فائدے حاصل کر سکتے ہیں، لیکن کیا ان سے ہمیں کائنات کے بارے میں کچھ مستحکم علم حاصل ہو سکتا ہے؟ خود علم کیا چیز ہے؟ ملا صدرا نے ان سوالوں کو اٹھایا نہیں۔ لہٰذا ہم لوگ یہ مسئلہ بھی حل نہ کر سکے کہ علوم عقلی یعنی سائنس سے جو علمی نکات ہمیں مستفاد ہوتے ہیں، کیا ان کی سچائی مطلق ہے، اور کیا یہ تمام کائناتوں کے لئے برابر کی سچائی ہے؟ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نکات علمیہ کی حیثیت صرف نظری اور موضوعی ہو؟ یا مختلف کائناتوں میں سچائیاں (یعنی سائنس کے قوانین) ہماری کائنات سے مختلف ہوں؟

مغربی سائنس سے ہم لوگوں کا مفصل تعارف انیسویں صدی میں ہوا۔ یہ زمانہ مغربی سائنس کے تبختر (Hubris) کا زمانہ تھا۔ سائنس داں یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اٹل سچائیوں کو دریافت کر رہے ہیں اور یہ سچائیاں ہر زمان و ہر مکان میں صحیح ہیں اور سائنسی مشاہدہ (Observation) اپنی جگہ پر آزاد حقیقت ہے، وہ مشاہد یعنی (Observer) کی ذہنی یا روحانی یا جسمانی صورت حال سے متاثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اقرار واقعی مشاہدے موجود ہوں تو ان سے حقیقت کا استنباط ہو سکتا ہے، اور اس استنباط کی بنا پر پیشین
گوئیاں کی جا سکتی ہیں۔ اور ان پیشین گوئیوں کو تجربے (Experiment) کے عمل سے گذار کر نظری حکمت (Theory) کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ تصور بھی عام تھا کہ زبان کسی نہ کسی سطح پر حقیقت کا بیان کر سکتی ہے۔ یعنی انیسویں صدی کی سائنس تیقن اور خود اعتمادی اور عقل کی قوت پر مطمئن ہونے اور مطمئن رہنے کی سائنس تھی۔ عقل کے بارے میں خیال تھا کہ یہ عقیدے سے برتر ہے، اور مشاہدے کے بارے میں خیال تھا کہ یہ کشف سے بہتر ہے۔ اور زبان کے بارے میں خیال تھا کہ یہ ریاضی کی سطح پر، یا ریاضیاتی انداز میں معروضی طور پر حقائق کا بیان کر سکتی ہے۔

سائنس کا یہ فلسفہ آج بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے جس طرح انیسویں صدی کے انگریزی تصورات سیاست ملکی و مالی کو کھلے دل سے قبول کیا، اسی طرح ہم نے انیسویں صدی کے انگریزی (یا مغربی) فلسفۂ سائنس کو قبول کیا۔ بظاہر اس فلسفے میں خدا، نبوت، وحی، کشف، تزکیہ نفس، معاد، وغیرہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ سرسید نے چاہا کہ قرآن کی سائنسی توجیہ کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ ناکام ہوئے (جس طرح آج کے لوگ اس قسم کی کوششوں میں آج پھر ناکام ہو رہے ہیں)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے یقین کر لیا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی نقطۂ اتفاق نہیں، سائنس پڑھنے سے ایمان چلا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عقل کے مقابلے میں ایمان زیادہ قیمتی ہے۔ سائنس سے اسی خوف کی بنا پر بعض مسلمان علما کو مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ سائنسی ایجادات اور نئی ٹکنالوجی کو برتنا تو ٹھیک ہے، لیکن خود سائنس پڑھنا ٹھیک نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ غیر علمی، غیر دیانت دارانہ، اور اصل مسئلے سے منھ چھپانے کی ایک بھونڈی ترکیب کے سوا کچھ نہیں۔ علاوہ بریں، سائنس کے میدان میں گڑ کھائیں اور گلگلے سے پرہیز والا رویہ چل نہیں سکتا۔

ٹکنالوجی اور سائنس، ٹکنالوجی اور تہذیب، ٹکنالوجی اور نئے تصورات، یہ سب ایک ساتھ چلتے ہیں۔ انٹرنیٹ اس کی نمایاں مثال ہے۔ نوبل انعام یافتہ مشہور سائنس داں اسٹیون وائن برگ (Steven Weinberg) نے لکھا ہے کہ روز صبح پہلا کام میں یہ کرتا ہوں کہ کمپیوٹر کھول کر لاس الاماس (Los Alamos) کی ویب سائٹ پر جاتا ہوں کہ دیکھوں کل سے آج صبح تک کے دوران میں نظری طبیعیات (Theoretical Physics) میں کون سی نئی باتیں ظہور میں آئی ہیں۔

اگر ہم جدید فلسفۂ سائنس کا مطالعہ کریں، یا جدید سائنسی افکار کو دیکھیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سائنس کی وہ قطعیت، اور اس کا دعویٰ کہ وہ "اٹل حقائق" سے معاملہ کرتی ہے، اب باطل ہو چکا ہے۔ آج کی سائنس بھی اپنے طور پر انکسار، شکوک اور بے یقینی کے دور سے گذر رہی ہے۔ اور یہ دور غالباً ہمیشہ قائم رہے گا، کیوں سائنس کے بارے میں ہمارے تصورات اب بدل چکے ہیں۔ اب سائنس کو مذہب کے لئے کوئی بہت طاقتور چنوتی نہیں کہا جا سکتا۔ اب سائنس میں اس طرح کا قول کسی استعجاب کا باعث نہیں بنتا کہ "حقیقت (خواہ وہ جانی جا سکتی ہو یا نہیں) اور اس کے پیکر (Image) کے درمیان ایک خلیج ہے۔"

اب فلسفۂ سائنس اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سائنسی بیانات بھی محض بیانیۂ اعظم (Grand Narratives) ہیں۔ یعنی جس طرح فلسفہ یا مذہب کائنات کو بیان کرنے، یعنی اس کی تصویر کھینچنے اور اس کے اسباب و علل کی داستان بیان کرنے کا عظیم الشان طریقہ ہیں، سائنس بھی اسی طرح کا بیانیۂ اعظم ہے۔ خواہ وہ ارتقائی حیاتیات (Evolutionary Biology) ہو یا نظریۂ اضافیت (Relativity)، کونیات (Cosmology) ہو، یا کوانٹم طبیعیات (Quantum Physics)، یہ سب تمام دوسرے بیانیوں کی طرح ناقص ہیں اور زبان کے محکوم ہیں۔ ان علوم کو حقیقت اصلی سے اسی قسم کا تعلق ہے جو کسی طنز ملیح (Irony) اور اصل صورت حال میں ہوتا ہے۔ طنز ملیح یا (Irony) کا تفاعل یہ ہے کہ وہ لفظ اور حقیقت کے مابین خلیج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً غالب۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

یہاں "ترے سر کی قسم" اور اصل حقیقت کے درمیان ایک تفاوت ہے۔ ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آیا اس فقرے کے متکلم کی مراد یہ ہے کہ "ہم تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارا سر کاٹ کر ہی رہیں گے۔" یا متکلم کی مراد یہ ہے کہ "ہم نے تمہارا سر نہ کاٹنے کی قسم کھائی ہے [لہٰذا ہمارا وعدہ محض طفل تسلی تھا]۔" یا اس کی مراد یہ ہے کہ "ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہارا سر ضرور کاٹیں گے۔" اصل معنی صرف متکلم کو معلوم ہیں، ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ اصل معنی کیا ہیں۔ بعض اوقات (Irony) طنز ملیح یوں پیدا ہوتا ہے کہ اصل معنی متکلم کو اور پاس کھڑے ہوئے سننے والے کو (مثلاً ڈرامے کے سامع کو) معلوم ہوتے ہیں، لیکن مخاطب کو نہیں معلوم ہوتے۔

سائنسی بیانات کے بارے میں اعتراف، کہ وہ بھی دیگر بیانات کی

طرح ہیں، یعنی سچائی ان کے اندر ہے، یا ان کے ماورا ہے، ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقت کے دوسرے ممکن سرچشمے اور خزانے، مثلاً اسطور (Myth)، مذہب، شعر و ادب، اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انھیں انسانی معاملات میں وہ جگہ دلائی جائے جس کا انھیں استحقاق ہے، اور صدیوں کی عقلیت پرستی نے جس سے انھیں بے دخل کر دیا ہے۔ بقول لوسی بیکیٹ (Lucy Becket) اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر سائنسی (یعنی مذہبی) بیانیہ اعظم میں ایک سچائی پوشیدہ ہے، بلکہ شاید اس میں سچائی کا کچھ جز، بلکہ شاید پورا ہی پورا سچ موجود ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ دو نتائج نکلتے ہیں:

(۱) سائنس کے بیانات اٹل اور مطلق اور تیقن سے بھرپور نہیں ہیں، جیسا کہ ابن رشد نے خیال کیا تھا، اور جیسا کہ ہم انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے زیر اثر سمجھتے آئے ہیں۔

(۲) مذہب کے بیانات میں بھی سچائی کے پوشیدہ ہونے، یا ان کے پورا پورا سچ ہونے کا امکان ہے۔

مندرجہ بالا نتائج لاخدا سائنس کی زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ سائنس جو خدا کے وجود میں یقین رکھنے کو دریافت حقیقت کے لئے لازمی شرط نہیں مانتی، اور کہتی ہے کہ سائنس کے مشاہدات، تجربوں، اور نتائج کی صحت کے لئے خدا کے وجود کا سہارا لینا، یا خدا کو مرافعے کی آخری عدالت (Court of Last Appeal) قرار دینا ضروری نہیں۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ خدا موجود ہے، تو ان نتائج کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جائے گا:

(۱) سائنس کے بیانات اٹل اور مطلق اور تیقن سے بھرپور نہیں ہیں، جیسا کہ ابن رشد نے خیال کیا تھا، اور جیسا کہ ہم انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے زیر اثر سمجھتے آئے ہیں۔

(۲) سائنس کے بیانات اسی وقت تک سچے ہیں جب تک وہ غلط نہیں ثابت ہو جاتے۔ سائنس کے بیانات میں سچ کا امکان ہے، لیکن یہ بات ثابت نہیں کہ ان میں سب کچھ سچ ہے۔ سائنس کے بہت سے نظریات اور پیشین گوئیاں عام دنیا میں صحیح ثابت ہوتی ہیں، لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نظریات اور پیشین گوئیاں مطلقاً اور دائماً سچ ہیں۔

(۳) مذہب کے بیانات اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ خدا کا وجود ہے۔ سائنس کا کوئی بیان خدا کے وجود کو کالعدم نہیں قرار دے سکتا، کیوں کہ سائنس کے تمام بیانات خود ہی غیر مطلق اور اضافی ہیں۔ خدا کے وجود میں یقین رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ مذہب کے بیانات سچ ہیں۔

(۴) لہٰذا سائنس کے ذریعہ مذہب کی بے دخلی ممکن نہیں، اور نہ مذہب ہی سائنس کو بے دخل کر سکتا ہے۔ یعنی اگر مذہب کا کوئی بیان سائنس سے متغائر ہو تو بھی مذہب کے بارے میں صرف یہ کہا جائے گا کہ یہ سائنس سے مختلف عالم کی بات ہے، لیکن دونوں یکجا بھی رہ سکتے ہیں، اس معنی میں کہ سائنس یہ نہیں کہتی کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ سائنس صرف یہ کہتی ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہمارے سروکاروں میں شامل نہیں۔ خدا کو معرض بحث میں لائے بغیر بھی سائنس کے مسائل پر بحث ہو سکتی ہے۔

(۵) ابن رشد کے اس خیال میں صداقت ہے کہ مذہب کی سچائیاں اور سائنس کی سچائیاں الگ الگ عالم سے ہیں، ان میں کوئی آویزش نہیں۔

آج کل امریکہ میں ایک بحث بہت زوروں پر ہے۔ ایک گروہ خود کو ''تخلیق پسند'' (Creationist) کہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ڈارون اور اس کے متبعین نے ارتقا (Evolution) اور تنازع للبقا (Struggle for Existence) اور بقائے اقویٰ (Survival of the Fittest) اور جینیاتی تغیر (Mutation of the Gene) وغیرہ کی جو باتیں کہی ہیں، وہ سب غلط ہیں۔ کرۂ ارض پر حیات (Life) کا وجود خدائے تعالیٰ کے منصوبے اور اس کی قوت تخلیق اور سنت ایجاد کا مرہون منت ہے۔ آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے، اور دنیا میں جتنے انواع حیات (Species of Life) ہیں، یا ہوئے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ نے فرداً فرداً تخلیق کئے ہیں۔ آپ کو معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ امریکی سائنس دانوں میں اس وقت کم و بیش تیس فی صدی ایسے ہیں جو خود کو کسی نہ کسی معنی میں ''تخلیق پسند'' (Creationist) کہتے ہیں۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو ''ارتقا پسند'' (Evolutionist) کہلاتے ہیں اور ڈارون اور اس کے متبعین کے وضع کئے ہوئے نظریۂ ارتقائے حیات کے ماننے والے ہیں۔ ان دونوں کے جھگڑے ملکی سیاست اور نظام و نصاب تعلیم پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ بہت سی امریکی ریاستوں نے اسکولوں کو اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ وہ ''تخلیق پسند'' (Creationist) اور ''ارتقا پسند'' (Evolutionist) دونوں مکاتب فکر کے خیالات کی تعلیم دیں۔

مذہب اسلام اور سائنس کے درمیان سب سے زیادہ تناقض مسئلۂ ارتقا (Evolution) کے مباحث میں ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہاں سائنس دانوں کی تمام باتیں خلاف مذہب ہیں۔ ہم میں سے بعض کے لئے یہ اطلاع حیرت انگیز اور نئی ہوگی کہ زمانۂ قدیم کے بعض مسلمان حکما نے ایسی باتیں کہی ہیں جن میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی پیش آمد (Anticipation) ملتی ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں (''مقالات شبلی''، جلد ہفتم، ص ۶۷):

> عام لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا جب پیدا ہوئی تو جمادات، نباتات، حیوانات، سب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوئے، اور الگ الگ پیدا ہوئے۔ ڈارون کی رائے ہے کہ پہلے صرف نوع پیدا ہوئی، وہی ترقی کرتے کرتے انسان کی حد تک پہنچ گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ دونوں احتمالوں میں کوئی قطعی نہیں، یوں بھی ہو سکتا ہے اور ووں بھی۔ اس لئے اتنا تو بہر حال مان لینا چاہیے کہ ڈارون جو کچھ کہتا ہے وہ ایسی چیز نہیں۔ جس کی ہنسی اڑائی جائے۔ وہ بھی ایک احتمال ہے اور تم جو کہتے ہو وہ بھی احتمال ہے، اور دونوں میں کوئی قطعی اور

یقینی نہیں۔

ملاحظہ ہو کہ سائنس کے بارے میں جو بات مغرب والے اب کہنے لگے ہیں (کہ سائنسی بیانات مطلق نہیں، احتمالی نوعیت کے ہیں)، اسے علامہ شبلی نے کوئی سو برس پہلے (۱۹۰۷ میں) کہہ دیا تھا۔ اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ علامہ کو اس رائے میں کوئی مذہبی قباحت نہیں نظر آتی کہ "پہلے صرف نوع پیدا ہوئی، وہی ترقی کرتے کرتے انسان کی حد تک پہنچ گئی۔" شبلی کی نظر میں یہ رائے، اور قرآن پاک میں بیان کردہ تخلیق آدم وحوا کی روایات، کوئی تضاد نہیں پیدا کرتیں۔ اگر وہ خیال کرتے کہ یہاں تضاد ہے، تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔

آگے چل کر علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ اخوان الصفا کے اراکین کے نظریات حسب ذیل تھے (ص ۶۹-۷۳):

(۱) نباتات کا انتہائی درجہ حیوانیت کے ابتدائی درجے سے متصل ہے، اور حیوانیت کا انتہائی درجہ انسانیت کے ابتدائی درجے سے ملا ہوا ہے۔

(۲) نباتات میں ایسے بھی ہیں جو جسم کے اعتبار سے نبات اور نفس کے اعتبار سے حیوان ہیں۔

(۳) سب سے کم درجے کا حیوان وہ ہے جس کے صرف ایک حاسہ ہوتا ہے۔ اس کے کان، آنکھ، شامہ، ذائقہ، کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اکثر کیڑے جو مٹی میں اور دریاؤں کی تہ میں پیدا ہوتے ہیں، اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

غور کیجیے، کون کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا خیالات میں ارتقا (Evolution) اور آغاز حیات کے ڈارونی تصورات کی جھلکیاں نہیں نظر آتیں؟ شبلی مزید لکھتے ہیں کہ ابن مسکویہ نے بھی اس مسئلے پر کلام کیا ہے۔ ابن مسکویہ کہتا ہے (ص ص ۷۳-۸۰):

(۱) جماد کا آخری درجہ نبات ہے۔ گھاس کا درجہ جماد اور نبات کے بیچ میں ہے۔ پھر نباتات میں قوت حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ اتنی ہو جاتی ہے کہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، وہ پھیلتا ہے اور تخم کے ذریعہ اپنی نسل کی حفاظت کرتا ہے۔

(خیال رہے کہ تنازع للبقا کی بحث میں تنازع للبقائے نفس کی جگہ تنازع للبقائے نسل یعنی "نسل کی حفاظت" کا تصور ہمارے زمانے میں رچرڈ ڈاکن (Richard Dawkin) نے سائنسی طور پر بیان کیا اور اسے "خود غرض جین" (The Selfish Gene) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔)

(۲) نبات جب اپنی منزل سے آگے بڑھتا ہے تو اس کا پہلا زینہ یہ ہے کہ زمین سے الگ ہو جائے، تاکہ وہ اختیاری حرکت کر سکے۔

(یہ بھی خیال رہے کہ جدید سائنسی بحثوں میں "زندہ" اور "غیر زندہ" (Life and non-life) میں فرق کرنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ "زندہ" کو حرکت ہے اور "غیر زندہ" کو حرکت نہیں۔)

(۳) حیوان ترقی کرکے انسان کی سرحد میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ درجہ بندر وغیرہ کا ہے جو انسان سے بالکل مشابہ ہیں اور ان میں اور انسان میں تھوڑا ہی فرق ہے، جس کو بندر اگر طے کر لیں تو بالکل انسان ہو جائیں۔

(واضح رہے کہ جدید جینیات (Genetics) کے مطابق انسان اور چمپانزی کے درمیان ۹۹ء۹ فی صدی جین مشترک ہیں۔ یعنی صرف اعشاریہ ایک فی صدی جین ہمارے جسم میں ایسے ہیں جو چمپانزی کے جسم میں نہیں ہیں۔)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اخوان الصفا اور ابن مسکویہ نے نظریہ ارتقا کا تقریباً خاکہ ہی بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں تنازع للبقا (Struggle for Existence) اور بقائے اقویٰ (Survival of the Fittest) اور جینیاتی تغیر (Mutation of the Gene) کے تصورات نہیں ہیں، لیکن بنیادی خاکہ سب موجود ہے۔ علامہ شبلی اپنے مضمون کے آخر میں نظامی عروضی کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:

(۱) جس قدر رحاسے کم ہوں گے، اتنا ہی کم درجے کا وہ ناقص حیوان ہو گا۔ کیچوے سے زیادہ کوئی ناقص حیوان نہیں ہوتا۔

(۲) بن مانس انسان کے بعد تمام حیوانات میں ترقی یافتہ ہے۔

اب آخر میں بیدل کا ایک شعر میں پیش کرتا ہوں

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابل صورت نہ شد
آدمی ہم پیش ازآں کادم بود بوزینہ بود

(اوائلی خاکہ نہ ہو تو کوئی بھی شکل صورت پذیر نہیں ہوتی۔ خود انسان پہلے بندر تھا، پھر انسان بنا۔)

یہ خیالات جن لوگوں کے ہیں ان کے بارے میں، یا ان خیالات کے بارے میں، کسی نے نہیں کہا کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ اور وہ سائنس داں جو خود کو "تخلیق پسند" (Creationist) کہتے ہیں، ان کو بھی لوگ سائنس داں ہی مانتے ہیں۔

ممکن ہے یہ بات اب کچھ واضح ہو چلی ہو کہ مذہب اور سائنس چاہے یک جا نہ ہو سکیں، لیکن ایک دوسرے کی راہ میں حارج بھی نہیں ہیں۔ فلسفۂ سائنس کے جدید نظریات کو ملحوظ رکھیں تو مذہب کی پابندی سے سائنس کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ ہم اگر جدید فلسفۂ سائنس کو اختیار کر لیں تو ہمارے لئے علوم عقلیہ میں ترقی کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ ☆☆☆

کیا کوئی ہے؟

رضوان الحق

طالب اور اس کی بیوی صالحہ گھر میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جارہا تھا ان کا خوف بھی بڑھتا جارہا تھا۔ دن تو کسی طرح کٹ گیا تھا لیکن اب یہ جنگل سی رات کیسے کٹے گی؟ یہ سوچ سوچ کر ان کے دل کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ انھوں نے گھر کو اجاڑ اور ویران ظاہر کرنے کے لیے گھر کی ایک بھی روشنی نہیں جلائی تھی، حتیٰ کہ ماچس کی ایک تیلی بھی روشن کرنے کا جوکھم نہیں لیا تھا۔ دوپہر تک وہ ٹی۔وی۔ پر خبریں سنتے رہے تھے لیکن جب ان سے وہ منظر نہ دیکھے گئے تو ٹی۔وی۔ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

کسی بھی طرح کے حملے کا امکان تھا۔ اور مختلف قسم کے حملوں سے بچنے کے لیے وہ صبح سے کئی منصوبے بنا چکے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ سارے منصوبے غیر محفوظ محسوس ہونے لگتے تھے۔ پہلے انھوں نے سوچا تھا کہ گھر کو بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے اور سارا اوپری معمولی سامان توڑ پھوڑ کر ادھر ادھر پھینک دیا جائے اور خود کسی معقول جگہ پر چھپ جایا جائے۔ اس طرح اگر کوئی آئے گا بھی تو یہی سمجھے گا کہ یہ گھر نپٹ چکا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد طالب کو خیال آیا کہ اس طرح تو محلے کا کوئی بھی شخص یہ سوچ کر آ سکتا ہے کہ چلو دیکھیں ممکن ہے ابھی کچھ سامان بچ گیا ہو، اسے کیوں چھوڑا جائے؟ اور مان لیا یہاں آکر وہ شخص ایک ایک کونا تلاش کرنے لگے؟ ایسے میں اگر ہم لوگ مل گئے تو پھر تو وہ مار ہی ڈالے گا۔

پھر ان دونوں نے ایک منصوبہ یہ بنایا کہ گھر کے کسی ایک حصے میں آگ لگا دی جائے... لیکن جو خامیاں پچھلے منصوبے میں تھیں وہ اس میں بھی موجود تھیں، ساتھ ہی ایک خطرہ اور بھی تھا کہ اس سے لوگوں کا دھیان خواہ مخواہ ہمارے گھر کی طرف جائے گا۔ یہ منصوبہ بھی خارج ہو گیا۔

جب اندھیرا پوری طرح مسلط ہو گیا تو ایک نئے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے طالب نے صدر دروازے پر جا کر باہر سے تالا بند کر لیا، گھر سے باہر نکل کر پچھواڑے ایک شکستہ سی پرانی سیڑھی تھی۔ اس کا باہری دروازہ وہ بھڑا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ اس سیڑھی کے ذریعہ چھت پر چڑھ کر وہ پچھواڑے کی طرف دھیرے سے کودا اور اس طرح اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا۔ پھر اندھیرے میں اس نے صالحہ کو ڈھونڈا اور اس کے ساتھ بے چینی سے گھر کے اندر ہی ادھر ادھر گھومنے اور سامنے کی سڑک پر آنے جانے والے ہر شخص کی آہٹ سننے لگا۔

اسے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں... اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہی لوگ تھے جن کا خوف تھا۔ وہ لوگ بہت چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر طالب نے جلدی سے اپنے پستول میں گولیاں بھر کر اسے ہاتھ میں سنبھال لیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس پستول سے ایسے حالات میں کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی۔

صالحہ کو بالکل چپ رہنے کا اشارہ کر کے اس نے سوچا، اب کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ جب دیر تک کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو وہ دونوں اپنی خوابگاہ میں پلنگ کے اندر رضائی اور گدوں کے درمیان چھپ گئے اور سانس روک کر جلوس نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

لیکن جلوس ان کے گھر کے قریب آ کر رک گیا۔ نعروں کی آواز اب اور بھی بلند سنائی دے رہی تھی۔ انھیں اپنی موت بہت قریب نظر آنے لگی۔ لیکن جہاں ان کے دلوں میں طرف موت کا خوف چھایا ہوا تھا وہاں بلوائیوں کے گندے گندے نعرے سن کر غصہ بھی آ رہا تھا۔ طالب بار بار لڑتے ہوئے مر مٹنے کو تیار ہو جاتا لیکن صالحہ اسے روک لیتی۔

کچھ وقت اور گذرا، لیکن لگتا تھا ابھی اتنی ہی رات ہے۔ ان لوگوں نے پاس کے ایک گھر میں آگ لگا دی اور آگے بڑھ گئے۔ ان کے گذر جانے پر طالب اور صالحہ کا خوف کچھ کم ہوا، لیکن پڑوسی کا گھر جلنے سے انھیں راحت ملے، افسوس۔ ان کے ہوش حواس کچھ درست ہوئے تو انھیں لگا پڑوسی کے گھر کی قربانی سے انھیں نئی زندگی ملی ہے۔ صالحہ اس سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

آج کا پورا دن خوف کی اسی کیفیت میں گذرا تھا اور اب سامنے رات کھڑی تھی کہ جانے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایسے شب و روز کا سلسلہ نہ جانے کتنا طویل ہوگا؟ باہر سے تالا ڈالنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں محسوس کر رہے تھے۔ دن میں ٹی۔وی۔ خبروں میں انھوں نے دیکھا تھا کہ لوگ کئی جگہ ٹرک لے کر

گئے، کسی گھر یا دکان کا تالا توڑ کر پورا سامان ٹرک میں بھر لیا اور جاتے جاتے گھر یا دکان میں آگ لگا دی۔ بہت سوچنے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ زینے کے پہلے موڑ اور چھت کے درمیان جو دو چھتی ہے، جس میں گھر کا سارا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور دوسرے غیر استعمالی سامان پڑے رہتے ہیں وہی سب سے محفوظ جگہ ہے، اس لئے وہیں چلنا چاہیے۔

بدقت تمام دو چھتی میں پہنچ کر انھوں نے دھندلے ماحول میں ممکن حد تک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اس حبس زدہ حصہ میں زینے کی طرف سے جانے والے راستے کے علاوہ ایک راستہ پیچھے بھی نکلتا تھا جو آگے جا کر گھر کی سب سے اندھیری کوٹھری میں پہنچتا تھا۔ اس کوٹھری تک پہنچنے کا ایک راستہ اور بھی تھا۔ اس دو چھتی کی بائیں دیوار گھر کی باہری دیوار تھی، اس میں ایک کھڑکی تھی جو مدتوں سے بند تھی۔ اس کھڑکی میں ایک باریک سی جھری بھی تھی جس سے باہر کے حالات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ دائیں طرف کی دیوار میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہ تھا۔

انھوں نے متعین کیا کہ اگر کوئی زینے کی طرف سے آئے گا تو اندھیری کوٹھری کی طرف بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی جائے گی اور اگر خدانہ خواستہ کوئی اس کوٹھری کی طرف سے آ گیا تو زینے کی طرف بھاگیں گے۔ پھر طالب کے ذہن میں ایک سوال اور گونجا، اگر دونوں طرف...؟ اس کا سر چکرا گیا کیوں کہ اس کے پاس امید اور دعا کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ ایک ہی طرف سے حملہ ہونے پر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ بچ ہی جائیں گے؟

لیکن اب اس نے بچاؤ کے دوسرے امکانات پر بھی غور کرنا شروع کیا۔ اسے سامنے کی کھڑکی کا خیال آیا کہ اس سے باہر کودنے پر ممکن ہے جان بچ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کھڑکی کے باہر کا جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ باہر تو بجلی کے ہائی وولٹیج تاروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ باہر کودنے پر تو اور بھی سخت موت دامن گیر ہو جائے گی۔ بجلی کے شاک کی موت بڑی تکلیف دہ...

اس نے ازسرنو دوسری جگہوں پر چھپنے کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا لیکن سارے غور و فکر کے بعد اسے گھر کی سب سے محفوظ جگہ وہی محسوس ہوئی جہاں وہ تھے۔ دونوں دو چھتی میں ایک ایسے گوشے میں بیٹھ گئے جہاں سے ان کا خیال تھا کہ باہر کا ہر منظر دیکھا جا سکے گا اور گھر کے اندر کی بھی آہٹیں سنی جا سکیں گی۔ دونوں نے کچھ دیر تک بڑے غور سے ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی اور چھوٹی سے چھوٹی آہٹ پر کان دھرے اس کا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ دو چھتی میں پڑے ہوئے پرانے فرنیچر میں دیمک لگی ہوئی تھی، کٹتے ہوئے اور دیمکوں کا لقمہ بنتے ہوئے فرنیچر کی مہین مہین آوازوں نے شروع میں ان دونوں کو خوف زدہ کیا لیکن آہستہ آہستہ بات سمجھ میں آ گئی اور ان آوازوں کا خوف ختم ہو گیا۔ کچھ دیر تک جب کوئی دوسری آواز نہ سنائی دی تو انھوں نے کچھ اطمینان کی سانس لی۔ صالحہ نے طالب کے شانے پر سر رکھ کر خود کو محفوظ سمجھ لیا۔ کچھ دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ طالب نے اسے غور سے دیکھا، پھر اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا جیسے بچے کو سلانے کے لئے تھپتھپاتے ہیں۔ لیکن طالب نے جیسے ہی صالحہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا وہ گھبرا کر اٹھ گئی اور جلدی سے بولی۔

کیا ہوا...؟ کیا ہوا؟''

یہ کہہ کر وہ طالب سے لپٹ گئی۔ طالب نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔

''شش! چپ رہو۔ کچھ نہیں ہوا۔ کچھ نہیں، تم آرام سے سو جاؤ۔''

کچھ دیر بعد صالحہ پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ طالب کو کچھ دیر تک جب کوئی ہلچل نہ سنائی پڑی تو وہ ماضی کے کچھ واقعات کے بارے میں سوچنے لگا، اور سوچتے سوچتے کئی برس پیچھے پہنچ گیا۔

طالب کے پاپا کی طبیعت آج صبح سے ہی کچھ خراب تھی لیکن پھر بھی وہ کوئی دوا کھا کر دکان چلے گئے تھے۔ شام سے طالب کی بھی طبیعت خراب ہونے لگی تھی اور رات کے کھانے کے بعد سے اس کی امی کی بھی۔ رات کے گیارہ بجتے بجتے تینوں شدید بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن پاپا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ جانے کیسا بخار تھا؟ پہلے کمزوری محسوس ہوئی، پھر بخار آیا، پھر منھ کا مزہ بہت خراب ہو گیا تھا، اس کے بعد پورے بدن میں ایسا درد اور اتنی کمزوری محسوس ہوئی کہ کسی بھی طرح چین نہ ملتا تھا۔ بس ایسی حالت تھی جیسے جسم سے روح پہلے ہی نکل چکی ہو لیکن کسی وجہ سے ابھی سانس گلے میں پھنسی ہوئی ہو۔ کم و بیش یہی کیفیت تینوں کی تھی لیکن طالب کے پاپا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی تشویش ناک تھی۔ ان کے منھ سے عجیب عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ابھی تک وہ لوگ اسے معمولی بخار ہی سمجھ رہے تھے لیکن یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے کہ آج تک ایسی بیماری کبھی نہ دیکھی تھی۔ آخر کار خود اپنی خرابی طبیعت کے باوجود طالب پاپا کی مدد کے لیے گھر سے باہر نکلا۔ لیکن ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ چکر کھا کر گر پڑا۔ اسے ہوش تو تھا لیکن پوری طرح سے نہیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

اس نے زور سے پکارا'' کوئی ہے...؟ کوئی ہے؟'' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ دور دور تک سناٹا سا چھایا ہوا لگتا تھا۔ بیچ بیچ میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سناٹے کو توڑ نہ سکتی تھیں۔ لیکن آواز تو تھی۔ کتوں کے چپ ہوتے ہی اس کا دل اور بھی گھبرانے لگتا۔ ''ارے کوئی ہے اے ے ے...؟ آ کر مجھے اٹھا لو!'' لیکن طالب یوں ہی تن تنہا بے یار و مددگار باہر پڑا رہا۔ بڑی دیر بعد اسے اپنے پاس کچھ کھسر پسر سنائی دی۔ کیا کوئی ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن جب آواز نزدیک آئی تو دم گھٹانے والی بدبو کے بھبکے سے اسے محسوس ہوا کہ یہ نالی کا چوہا تھا، نہایت تنومند اور خونخوار۔ لیکن چوہے نے اسے نظر انداز کیا۔ رات جیسے جیسے گذرتی جا رہی تھی اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کی گرمی بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا ہاتھ پاؤں میں برف لگی ہوئی ہے۔ غنودگی کے عالم میں کابوس بھی بار بار اپنی گرفت میں لے لیتے تھے۔

اس نے دیکھا کہ انسانوں کا ایک طویل ہجوم بے ترتیبی سے دوڑ رہا

ہے۔ سب ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور بار بار راستہ بھٹک رہے ہیں۔ آخر کار کچھ چوہے آ کر ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ چوہے آگے آگے چلتے ہیں اور آدمی پیچھے پیچھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ کسی چیز کو سونگھتے ہیں اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد مر جاتے ہیں اور انسان بھی انھیں کی تقلید کرتے ہیں۔

اس کے بعد طالب کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ گرد و پیش کی ہر آہٹ کو سننے کی کوشش کرتا ہے، کہیں سے کسی پتے کے ٹوٹنے کی یا ہوا کے چلنے کی بھی آواز آتی ہے تو وہ چیخنے لگتا ہے۔ ''کوئی ہے...؟ کوئی ہے؟'' تھوڑی دیر بعد اس کے چیخنے کی آواز دھیمی پڑنے لگتی ہے اور دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر ایک بار کابوس اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ کسی لمبے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ بہت دشوار راستے ہیں، تیز دھوپ ہے، پھر بارش ہوتی ہے، برف باری ہوتی ہے، لیکن وہ لوگ کسی طرح گرتے پڑتے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ آخر کار ایک تیز طوفان آتا ہے اور انھیں زمین پر گرا جاتا ہے۔ طالب کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ درست ہوتے ہیں تو طالب ایک بار پھر اسی طرح پکارتا ہے:

''کوئی ہے...؟ ارے کوئی ہے؟ بھئی بولتے کیوں نہیں؟ کوئی ای ی ی ی ہے؟''

ایک ایمبولینس آ کر رکتی ہے اور اس میں سے اٹھارہ بیس سال کا ایک لڑکا اترتا ہے، وہ لڑکا اس کے محلے میں رہنے والا مکیش تھا۔ طالب کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''کیا ہوا؟ طالب بھائی آپ یہاں کیسے پڑے ہوئے ہیں؟''

طالب اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا۔

''مکیش میرے پاپا بہت بیمار ہیں، انھیں کسی طرح بچالو، انھیں اسپتال پہنچوا دو، میں عمر بھر تمھارا احسان مانوں گا۔''

''اس میں احسان کی کیا بات ہے طالب بھائی، یہ تو میرا فرض ہے۔''

ایمبولینس میں بٹھا کر لوگ اسے ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔ کئی دن کی جدوجہد کے بعد طالب اور اس کی امی تو بچ جاتی ہیں لیکن اس کے پاپا کا انتقال ہو جاتا ہے۔

کہیں بہت دور سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی تو طالب کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ پھر اسی دہشت ناک زمانے میں آ گیا۔ صالحہ کی غنودگی اب ختم ہو چکی تھی۔ دونوں نے اس آواز کو غور سے سننے کی کوشش کی لیکن دوبارہ کوئی چیخ یا پکار نہ سنائی دی۔ طالب نے سوچا ظالموں نے نہ جانے کس ہتھیار سے مارا ہو گا کہ دوبارہ آواز تک نہ نکل سکی۔ تھوڑی دیر تک وہ ہر آہٹ پر کان دھرے رہے لیکن جب کوئی آواز نہ سنائی دی تو صالحہ نے چپکے سے کہا۔

''چلو آپا کے یہاں فون کر کے دیکھتے ہیں ممکن ہے اب بات ہو جائے۔''

''اچھا، تم یہیں رہو میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔''

''نہیں، اکیلے نہ جاؤ۔ میں تمھارے چلوں گی، مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔''

طالب نے پستول ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم بھی چلو۔''

فون مردہ تھا۔ طالب نے جھنجلا کر ریسور پٹکتے ہوئے کہا۔

''اب تو لائنیں انڈر گراؤنڈ ہیں، پھر بھی نہ جانے کیسے فساد شروع ہوتے ہی فون ڈیڈ ہو جاتے ہیں۔ آپا کا فون تو صبح سے ہی ڈیڈ تھا اب ہمارا بھی گیا۔ اللہ ہی جانے آپا اور ان کے گھر والے کس حال میں ہوں گے۔ اس محلے کی حالت تو پرسوں ہی سے بہت بگڑی ہوئی ہے۔''

دونوں چپکے چپکے قدم رکھتے اسی کباڑ خانے میں واپس آ گئے اور ایک بار پھر اپنے خیالوں میں ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ بہت دور پر کسی مکان کے جلنے کی سرخی مائل زردی اور گاڑھا دھواں نظر سا محسوس ہو رہا تھا، لیکن وہ اتنی دور تھا کہ کوئی آواز ان تک نہ پہنچ رہی تھی۔ شاید ان کا وہم ہو، اتنی دور سے اور دو چھتی پر سے بھلا کیا دکھائی سنائی دے گا۔ دونوں بالکل ساکت ہو گئے۔ اب وہ سانسوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی بھی آواز نہیں کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب کوئی آہٹ سنائی پڑتی تو وہ کچھ دیر کے لیے سانس بھی لینا بھی روک دیتے تھے۔

طالب کے ذہن میں اس وقت نئے نئے خیالات کی یلغار تھی۔ نہ جانے کون سا لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ٹھہرے، اس لئے وہ بار بار اپنے گذشتہ دنوں کا احتساب کرنے لگتا... ذہن میں نہ جانے کون کون سے منظر بننے بگڑنے لگتے، نہ جانے کیسی کیسی شخصیتوں کے چہرے ذہن کے پردے پر ابھرنے اور مٹنے لگتے۔ لیکن اچانک اس کا ذہن ایک بار پھر ماضی کے ایک نقطے پر جا کر ٹھہر گیا۔

وہ ۲۶ جنوری کی صبح تھی، دکان بند ہونے کی وجہ سے آج وہ دیر سے اٹھا تھا۔ معمولات سے فارغ ہو کر وہ باورچی خانہ میں کھڑا کھڑا ہی ناشتہ کر رہا تھا۔ امی اسے ناشتہ دے کر کسی کام سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ابھی اس نے چند ہی نوالے کھائے تھے کہ اچانک زمین ہلنے لگی۔ کسی نے پورے باورچی خانے کو اس طرح ٹیڑھا کر دیا کہ طالب کو اس کی چھت زمین جیسی لگنے لگی۔ ساری بتیاں گل ہو گئیں، لیکن کہیں چھت میں کوئی سوراخ سا تھا جس سے کچھ روشنی آ رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے اور ایک کونے کے درمیان لڑھک گیا۔ کہیں یہ کوئی جن یا بھوت تو نہیں؟ ان باتوں اسے یقین تو نہ تھا، لیکن اس وقت اسے خیال آیا کہ جنوں کا ذکر تو قرآن پاک میں بھی ہے اس لیے جن تو ضرور ہوتے ہوں گے؟ قرآن کا خیال آنے پر اسی گھبراہٹ میں اسے چند روز پہلے کی ایک بات یاد آ گئی۔ اس روز مولانا نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

''اللہ تعالٰی نے قرآن میں قیامت کی جو نشانیاں بتائی ہیں، وہ سارے آثار اب نمایاں ہیں۔ لوگو سنو اور دیکھو اور توبہ کرو بہت جلد قیامت آنے والی ہے۔''

تو کیا قیامت آگئی؟ زور سے گرنے کے باعث اس سر چکرا رہا تھا۔
سارے گھر میں عجب طرح کی غراہٹ اور گھر گھراہٹ دوڑتی پھر رہی تھی۔ لیکن اس نے جلد جلد اپنی زندگی کا ایک مختصر احتساب کر ڈالا۔ اس سرسری احتساب پر بھی اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ میں نے قیامت کی مناسب تیاری نہیں کی ہے۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا، پھر لگا کہ ہزاروں بادل ایک ساتھ گزر گئے ہیں۔ اس کے منھ سے بہت تیز چیخ نکلی لیکن اوپر سے ڈھیر سارا ملبہ آ گرا اور اس کی چیخ دب گئی۔ اس کا حلق مٹی سے بھر گیا لیکن کوشش کر کے اس نے آواز دینی شروع کی۔

''کوئی ہے...؟ ارے بچاؤ۔ نکالو نکالو... کوئی ہے؟''

لیکن اس کا گلا اس قدر خشک تھا اور چاروں طرف شور اس قدر تھا کہ اس کی آواز اگر بلند بھی ہوئی تو کہیں باہر نہ پہنچی۔

اب وہ اینٹوں اور لوہے کی چھڑوں اور سیمنٹ چونے کے ڈھیر میں دبا پڑا تھا۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا لیکن کمر کے پاس کچھ کیفیت نہ تھی، جیسے وہ حصہ سن ہو گیا ہو۔ ''کیا میری کمر ٹوٹ گئی ہے؟'' اس نے گھبرا کر اپنے پاؤں کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ لیکن اس کی ٹانگوں پر تو مٹی اور اینٹوں کا لا انتہا بوجھ تھا۔ چاروں طرف ملبہ ہی ملبہ اور ہر طرف گونج، پکار اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن اس نے جب پیروں کو سمیٹنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ انھیں ایک محدود دائرے میں ہی ہلا سکتا ہے، ملبے کے ڈھیر سے نکال نہیں سکتا۔ اسے اپنی امی کا خیال آیا تو اس نے گردو پیش کی بے شمار آوازوں میں اپنی امی کی آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کچھ دیر میں اسے لگا کہ وہ ان کی آواز کو پہچان گیا ہے۔ آواز واضح نہ تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہیں۔

''طالب، بیٹا طالب! تم کہاں ہو؟''

طالب نے خوش ہو کر امی کو جواب جواب دینے کی کوشش کی۔

''میں یہاں ہوں امی! امی میں یہاں ہوں باورچی خانے میں۔''

''بیٹا میں تمھیں کیسے باہر نکالوں؟ باورچی خانہ تو نظر ہی نہیں...'' ان کی آواز جو ہلکی تو تھی ہی، شور میں دب گئی۔

دیر تک وہ ایک دوسرے کی آواز سنتے رہے لیکن دھیرے دھیرے امی کی آواز پست سے پست تر ہوتی چلی گئی۔ لوگوں کے چیخنے کی آوازیں تو ابھی بھی اسی طرح آرہی تھیں لیکن مکانوں کے گرنے کی آوازیں اب بہت کم ہو گئی تھیں۔ اس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ یہاں سے نکلوں کس طرح اور امی کو کس طرح بچاؤں۔ کہیں وہ ختم...

اس کے سامنے دو ہی راستے تھے: مدد کا انتظار کرے اور ساتھ ہی ساتھ ملبہ ہٹا کر راستہ بنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن مدد؟ بھلا اس کا امکان ہی کتنا تھا۔ اپنا راستہ نکالنے کے لئے وہ زور کرنے لگا لیکن ٹانگیں تو دبی ہوئی تھیں۔ اگر وہ صحیح سلامت ہیں تو بھی کئی گھنٹے کی مشقت درکار تھی۔

اس نے جان توڑ کر زور لگا دیا لیکن اس کی ٹانگیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اب کوئی آئے تو ہی میں بچ سکوں گا۔ لیکن بھلا کون آئے گا؟ سب کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔ امی اور آپا کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کی حالت اور بھی بگڑتی جا رہی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ جب روشنی بالکل زائل ہو گئی اور چاروں طرف بے تحاشا اندھیرا چھا گیا تب اسے لگا کہ شاید اب رات ہے۔ اب بھلا رہائی کہاں ممکن ہوگی؟ ملبے کا ڈھیر اسے ملک الموت کی طرح نظر آنے لگا۔ اوپر سے اینٹیں اور گرد و غبار کے ڈھو کے ملبے کے ڈھیر ابھی بھی تھوڑے تھوڑے وقفے پر گرتے اور لڑھکتے پھر رہے تھے۔

''کوئی ہے؟ ارے بھائی کوئی ہے؟ میں یہاں ہوں! امی بھی یہیں ہیں کہیں ہیں! سنتے کیوں نہیں لوگو؟ کوئی ہے؟ کوئی ہے؟''

لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔ ملبے سے نکلنے کی کوشش نے اس کے ناخن اور انگلیاں لہولہان کر دی تھیں۔ پرانے زخم ابھی خشک نہ ہوتے کہ زور لگانے پر نئے زخم بن جاتے۔ اس کا بہت سارا خون بہ چکا تھا۔ اور شاید اندر بھی کہیں جریان خون نہ ہو رہا ہو، کوئی اندرونی چوٹ بھی نہ ہو۔ رات ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی، اور دھیرے دھیرے اس کا بدن بھی ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔

کہیں دور سے سائرن کے بجنے اور ہارن کی آواز آئی، جسے سن کر طالب نے ایک بار پھر پکارنے لگا۔

''ارے میں یہاں ہوں! کوئی ہے جو مجھے بچالے؟''

وہ لوگ (اگر واقعی کوئی تھے) دور نکل گئے۔ امید کی جو ہلکی سی کرن چمکی تھی وہ سیاہ پڑ گئی۔

آخر کار اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کو یاد کرنے لگا۔ اس نے ان تمام مذہبی کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کی جن میں موت اور موت کے بعد کے حالات کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام اعمال یاد کیے اور حساب لگا کر اپنے گناہوں اور نیکیوں کو تولنے کی کوشش کی کہ کسی طرح شاید نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے۔ لیکن اس کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ یہ سب سوچتے سوچتے وہ بے ہوش ہو جاتا اور اسے خبر ہی نہ ہوتی کہ نہ جانے کتنی دیر تک بے ہوش پڑے رہنے کے بعد اسے کب ہوش آیا اور کب پھر وہ بے ہوش ہوا۔

ایک بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی اور رات کے ختم ہونے کا احساس ہوا۔ ابھی وہ صورت حال کا اندازہ کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں اسے کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ طالب پھر چیخا۔

''کوئی ہے؟ بچاؤ مجھے۔ بچا لو اللہ۔ کوئی ہے؟ ارے کوئی تو ہے!''

اس بار واقعی جان بچانے والے رضا کار تھے اور انھوں نے طالب کی گھٹی گھٹی پکار سن بھی لی اور فوراً اسے نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ دوسری بار ہوش آنے پر طالب نے دیکھا کہ ان لوگوں میں مکیش بھی موجود ہے تو اسے اور بھی تشفی ہوگئی کہ یہ لوگ لوٹ مار والے نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ امبولینس اور ڈاکٹر بھی تھے۔ طالب نے ہوش میں آتے ہی اپنی امی کے بارے میں بتایا تو ان لوگوں نے ان کو

ڈھونڈنا شروع کردیا۔ طالب جب ایمبولینس میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس میں کیلاش کی ممی بھی زخمی حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ ایمبولینس کو روکے رکھا گیا کہ اگر طالب کی امی زندہ نکلیں تو سب کو ایک ساتھ ہسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن... طالب انھیں دیکھ کر تاب نہ لا سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ ان کے بدن پر کئی چوٹیں تھیں اور روح خدا جانے کب قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اسی وقت ایک بار پھر ایک بھیڑ ان کے گھر سے کچھ دور پر گذری۔ وہ لوگ وہی پرانے نعرے لگا رہے تھے۔ آوازیں سنتے ہی صالحہ طالب سے یوں لپٹ گئی گویا طالب کی باہوں میں چھپ جائے گی تو کوئی اسے دیکھ نہ پائے گا۔ لیکن ان لوگوں نے طالب کے گھر کی طرف دھیان نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے۔ شور اور قدموں کی دھمک کے گذر جانے کے بعد طالب نے صالحہ کی طرف دیکھا۔ وہ سات مہینے کی حاملہ تھی۔ یہ سوچتے ہی طالب کو دن کا وہ واقعہ یاد آ گیا جسے یاد کر کے اس کا جسم ہی نہیں روح تک لرز اٹھی۔ وہ عورت بھی تو سات مہینے کی حاملہ... اس نے صالحہ کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا اور دل میں عہد کیا کہ کچھ ہونے کے پہلے وہ صالحہ کو خود گولی کا نشانہ...

ان کا جسم کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز بہت تیز آواز کے ساتھ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ دونوں گھبرا گئے کہ وہ کوئی بم تو نہیں۔ طالب پستول سنبھال کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ اگر وہ بم نہیں تھا تو کوئی اور چیز، کوئی لوٹا ہوا سامان تو نہیں تھا جسے لٹیرے نے بھاگنے کی گھبراہٹ میں ادھر پھینک دیا ہو؟ لیکن گھر تو ہر طرف سے بند تھا۔ تو پھر... کہیں کسی نے اس شے کے لڑھکنے کی آواز سن تو نہیں لی؟ دونوں ایک لمحے کے لئے سن ہو گئے۔

صالحہ نے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ شدید اندھیرے میں طالب کو کسی سائے کا احساس ہوا کہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف آ رہا ہے۔ اب اس جگہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ شخص اگر آواز کا نشانہ لگا کر گولی چلائے گا تو ہم اس کی زد سے باہر رہیں گے۔ طالب نے ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا کہ کوئی ایسا سامان نہ ہو جس سے ٹکرانے سے پھر آواز ابھرے۔ دھیرے دھیرے وہ دو چھتی سے اترے اور رینگتے رینگتے دور کھسک گئے۔ وہ سایہ بھی اسی بے فکری کے ساتھ ان کے گھر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب وہ سایہ کچھ اور قریب آ گیا تو لگا کہ وہ ایک نہیں دو تین لوگوں کا سایہ ہے۔ لیکن چال کی بے فکری کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ بلوائی تو تیز تیز دوڑتے ہیں یا چھپ کر حملہ کرتے ہیں۔ ایسی مٹر گشتی والی چال... ایسے ماحول میں اتنی بے فکری سے کون گھوم سکتا ہے...؟

زور سے ڈکرانے کی آواز آئی اور وہ سائے ایک بھینس کی شکل میں بدل گئے۔ اس کا مالک شاید مر چکا تھا یا وہ کہیں سے رسہ تڑا کر بھاگ گئی تھی۔ دونوں نے کچھ اطمینان کی سانس لی، لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر کسی کے قدموں کی سی آواز سنائی دی، پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی... پھر ہلکی ہلکی کھٹ... کھٹ... پھر وہی خاموشی۔ یہ کیا اسرار ہے؟ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور پھر غائب کیوں ہوئی جا رہی ہے؟

کچھ دیر بعد کہیں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ آواز کیلاش کے گھر کی طرف سے آئی تھی لیکن اتنی اندھیری رات میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ آواز وہیں سے آئی تھی یا کہیں اور سے۔ جب اس نے بہت آنکھیں گڑھ کر دیکھا تو دکھائی سا دیا کہ اس گھر سے دو تین سائے باہر نکلے ہیں۔ وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا لیکن کچھ ہی لمحوں میں وہ سب کہیں اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اندھیرے اور سائے میں فرق ہی کیا ہے؟ طالب نے سوچا، لیکن کوئی بات نہیں وہ تو اپنا دوست ہے، اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اسی دم ٹی۔ وی۔ خبروں کا وہ منظر اسے یاد آ گیا جس میں ایک چھوٹے سے بچے نے، جو پلنگ کے نیچے چھپ جانے سے بچ گیا تھا، پولیس والوں کو بتایا کہ اس کی ممی کو گولی ''بھیا'' نے ماری تھی۔

اچانک محسوس ہوا کہ قریب میں کہیں کچھ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ طالب نے صالحہ سے سرگوشی کی، ''سنتی ہو؟ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ذرا کان لگاؤ۔'' دونوں نے ان آوازوں کو غور سے سننے کی کوشش کی لیکن کوئی بات واضح نہ ہو سکی۔ کچھ دیر بعد ان لوگوں کے چلنے کی آوازیں سنائی پڑیں۔ وہ سانس روک کر ان آوازوں کو سننے لگے کہ وہ آوازیں گھر کے قریب آتی جا رہی ہیں یا دور ہو رہی ہیں۔

اچانک طالب نے محسوس کیا کہ کوئی گھر کے پچھواڑے سے آ رہا ہے۔ اس نے صالحہ کے کان میں کہا۔

''کوئی ہے؟''

صالحہ نے سرگوشی کی:

''لگتا ہے کئی آدمی ہیں اور دونوں طرف سے آ رہے ہیں۔''

سامنے کی گلی میں کئی طرح کی چال ڈھال نظر آتی تھی۔ کچھ سائے چار پیروں پر تھے اور کچھ دو پیروں پر۔ کچھ تو تین پیروں پر، یا دو پاؤں اور ایک لاٹھی (بندوق؟) کے سہارے چل رہے تھے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں، یہ انسان ہیں یا بھت پریت یا بدروحیں؟ اسے یاد آیا کہ اس کے بچپن میں اس کے بڑے ماموں کہتے تھے کہ اندھیری رات میں چڑیلیں رائفل لے کر رقص کرنے نکلتی ہیں۔

طالب کے ہاتھ میں پستول اب بھی تھا لیکن ایسے دہشت انگیز اور پر اسرار دشمن پر پستول کیا کرتا۔ دونوں چپکے چپکے اوپر گئے۔ پھر انھوں نے پچھلی دیوار کی کھڑکی آہستہ سے کھولی اور باہر گلی کے پار پڑوسی کے گھر کے لئے چھلانگ لگا دی۔ گرتے گرتے ان دونوں نے سرگوشی میں کہا:

''کوئی ہے... کوئی ہے۔'' ☆☆☆

تین نظمیں

فیصل ہاشمی

ہر بار شکستہ بال و پر

یہ ایک شدید محبت کا
انجام ہے یا...
جو دور تلک اس وادی میں
ذی روح مہیب اداسی میں
افلاک کی جانب نظروں کا
ہر دن سندیسہ بھیجتے ہیں
ہر بار شکستہ بال و پر
ہم خون میں لتھڑے لوٹتے ہیں

کئی لمحے

تمھیں معلوم ہے جب بھی
پرانے یار... گلیوں کی
یوں ہی بے سود باتوں میں
کئی گھنٹوں کی بے مصرف نشست رائیگاں کو
یاد کرتے ہیں تو کتنا لطف آتا ہے

پرانے گھر میں گذرے پل
اور ان میں سب کہی اور ان کہی
باتوں کو جب دہرایا جاتا ہے
تو کتنا لطف آتا ہے

تمھیں معلوم ہے کہ اس طرح کے
ان گنت لمحے جنھیں ہم یاد کرتے ہیں
جنھیں ہم ڈھونڈتے ہیں
زندگی کی ہر اداسی میں
مقید ہیں گھڑی کے عین مرکز میں
رواں، ان سوئیوں کی بے صلہ، بے کار حرکت میں

تمھیں معلوم ہے
جب بھی مجھے ان کی ضرورت تھی
تو میں نے وقت سے
ان آخری ایام میں کتنی گذارش کی
مجھے دے دو وہ سب لمحے
کہ اب ان کی ضرورت ہے، تو وہ مجھ سے یہی کہتا:

"کئی لمحے... کلائی پر بندھی
گھڑیوں سے باہر ہیں۔ انھیں میں کیسے واپس دوں؟"

زمیں پہ آخری لمحے

اندھیرے دوڑتے ہیں رات کی ویران آنکھوں میں
چراغوں کی جڑوں سے روشنی کا خون رستا ہے

سمندر کشتیوں میں
چھید کرتی مچھلیوں سے بھر گئے آخر

صدا اس قید گہ سے
بھاگ جانے کی کڑی کوشش میں زخمی ہے

زمیں فالج زدہ ہونٹوں کی جنبش سے
ٹھہر جانے کو شاید کہہ رہی ہے
ہوا کی سانس ٹھوکر کھا رہی ہے

غزلیں

عالم خورشید

روز کوئی دیا جلاتا ہوں
روز آندھی کو آزماتا ہوں

ہر گھڑی ٹوٹنے کا خطرہ ہے
ہر گھڑی کچھ نہ کچھ بناتا ہوں

کیا ہے اسرار کیوں یہاں آخر
روز آتا ہوں روز جاتا ہوں

کچھ کسی سے میں پوچھتا کب ہوں
کچھ کسی کو کہاں بتاتا ہوں

کب کسی کو خیال رہتا ہے
کب میں جاتا ہوں کب میں آتا ہوں

خود مجھے بھی خبر نہیں کیا کیا
خود ہی لکھتا ہوں خود مٹاتا ہوں

یاد رہتا نہیں سبق کچھ بھی
روز پڑھتا ہوں بھول جاتا ہوں

پھول کھلتے نہیں ہیں باغوں میں
پھول کاغذ پہ اب کھلاتا ہوں

اپنی گردن میں موچ آتی ہے
اپنے سر کو اگر جھکاتا ہوں

کیا عجب حال ہوگیا عالم
کیا سنانا تھا کیا سناتا ہوں

یہ سوچا نہیں ہے کدھر جائیں گے
مگر ہم یہاں سے گذر جائیں گے

ہمیں یہ فضا راس آتی نہیں
یہاں ہم رہیں گے تو مر جائیں گے

ڈراتا بہت ہے یہ دریا ہمیں
سو دریا میں اک دن اتر جائیں گے

یہ دل رہنما ہے یہ دل ہمسفر
جدھر دل کہے گا ادھر جائیں گے

جو روکیں گی رستہ کہیں منزلیں
گھڑی دو گھڑی کو ٹھہر جائیں گے

بہاروں نے مرجھا دیا ہے ہمیں
تو کیا ہم خزاں میں سنور جائیں گے

اسی خوف سے نیند آتی نہیں
کہ ہم خواب دیکھیں گے ڈر جائیں گے

عبث یہ گماں تھا ہمیں دیکھ کر
سبھی راستے میں ٹھہر جائیں گے

اسی خوش گمانی نے تنہا کیا
جدھر جاؤں گا ہمسفر جائیں گے

یہ سوچا تھا کب شہر سے دشت میں
مرے ساتھ دیوار و در جائیں گے

کہاں دیر تک رات ٹھہری کوئی
کسی طرح یہ دن گذر جائیں گے

تغیر ہے لازم تو عالم کبھی
ستارے زمیں پر بکھر جائیں گے

جلیس نجیب آبادی

برستی رات کی یادیں ہیں کیا بتاؤں اسے
جو ہو سکے اسی بارش میں دیکھ آؤں اسے

اگر یقین ہو مجھ کو منانے آئے گا
تو روٹھنے کی طرح روٹھ کر دکھاؤں اسے

یہ کیسی آرزو لیتی ہے دل میں انگڑائی
وہ مجھ کو یاد کرے اور میں بھول جاؤں اسے

وہ حال پوچھے، میں زعم انا میں کھو جاؤں
اور اس کے بعد بہت دیر تک رلاؤں اسے

بس اس کے گرم تنفس کا لمس کافی ہے
متاع غیر ہے سینے سے کیا لگاؤں اسے

تمام گھر کی چھتیں صبح سے برستی ہیں
میں ایسی رات میں کس طرح ساتھ لاؤں اسے

دو چار دن یہاں ٹھہرے گا لوٹ جائے گا
جو مجھ میں شہر خلا ہے وہ کیا دکھاؤں اسے

مری اک عمر...

مری اک عمر کا اندوختہ جس میں
نہ کلیاں ہیں، نہ موتی ہیں
انھیں تم سنگ ریزے کہہ کے ٹھکرا دو
قلم سے جس قدر چنگاریاں برسیں
انھیں تم راکھ سے تشبیہ دے دو۔ میرے
آنسو جو سیاہی بن کے کاغذ پہ ٹپکے ہیں
سب تمھاری نذر کرتا ہوں
مری منظوم تقصیریں
جو میرے جان لیوا رتجگوں کی خود شہادت ہیں
تمھارے سامنے ہیں سب
مرے خون جگر کا کتنا کتنا کس قبیلے سے تعلق ہے
یہ تم جانو

یہ رنگارنگ تحفے
جو سروں کی شکل میں میرے لیے تم نے سجائے ہیں
انھیں میں شکریے کے ساتھ واپس کر رہا ہوں
بس
مری گردن پہ میرا سر ہی رہنے دو

گئی ہے میر گولی کان پر سے

شکیلہ رفیق

میں اپنے ہاتھوں کے بارے میں ہمیشہ خوش فہم واقع ہوئی ہوں اور ان کے بناؤ سنگھار کے انتظامات میں یوں مصروف رہتی ہوں جیسے شب عروسی کی دلہن سجائی جاتی ہے۔ چہرے سے زیادہ وقت ان کی دیکھ بھال پہ صرف کرتی ہوں۔ ہاتھوں پر پابندی سے دن رات والے ہینڈ لوشن کی مالش، manicure، medicure اور نہ جانے کیا کیا۔ اور پھر سب سے آخر میں لباس کے رنگ پر جاتی ہوئی ناخنی پالش انھیں حقیقتاً ایک نیا روپ دے دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میرے ہاتھ آج بھی کنواریوں جیسے ملائم اور خوبصورت ہیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ ایک بھیگی رات کو کراچی جیسے بے موسم شہر سے بیاہ کر میں ایک بہت بڑے اور ٹھنڈے ملک کے ایک یخ بستہ شہر ٹورانٹو آ پہنچی۔

مجھے دستانوں سے نفرت اس روز ہوئی جب انھوں نے میری فنکاروں جیسی مخروطی انگلیوں کو اپنے اندر یوں چھپا لیا جیسے کنواریوں کو محلے کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی بری نظر سے چھپا دیا جاتا ہے۔

وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شب تھی جب عنابی رنگ کے کوٹ سے ملتے ہوئے عنابی ہی رنگ کے دستانے پہناتے ہوئے اریب نے مجھ سے کہا۔

"یہاں کی سردی سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے... ورنہ ٹھنڈ لگ جاتی ہے۔"

میں صرف مسکرا دی اور کچھ کہے بغیر میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ ٹرمنل سے باہر نکلتے ہی دو یخ بستہ پتھر میرے گالوں پر پڑے۔ میں دونوں رخسار باری باری سہلاتی اور تقریباً بھاگتی ہوئی جا کر گرم گاڑی میں بیٹھ گئی۔

کراچی جیسا شہر، جہاں اگر کبھی سردی آتی بھی ہے تو وہ بھی مانگے کی، کوئٹہ سے ادھار میں دو چار روز کی ٹھنڈ آئی اور کب چلی گئی، پتہ بھی نہ چلا۔ وہاں دستانے تو کیا کبھی پوری آستین کا سوئیٹر بھی نہ پہنا تھا اور یہاں سر سے پاؤں تک سب کچھ گرم چیزوں سے چھپا لینا ہی صحت کے لئے مقدم ہے۔

ٹورانٹو بے حد خوبصورت، ستھرا نکھرا شہر ہے۔ سردی کے موسم میں جہاں کی یخ بستگی مکانوں کی چھتوں پر برف جما کر انھیں بگلے سے زیادہ سفید کر دیتی ہے اور پھر اس پر اگر برفیلی بارش ہو جائے تب یہ منظر اور سہانا ہو جاتا ہے۔ اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے لٹکتی قلم نما برف کی لڑیاں ان چھوٹی کڑیوں کے خوابوں کی طرح مسحور کر دیتی ہیں۔

ابتدا میں اس برفیلے حسن سے میں نہ صرف محظوظ ہوئی بلکہ مسحور بھی ہوئی... سترہویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کے شیشوں کی دیواروں سے برف گرتے دیکھی تو کچھ بے حد پرکشش لگتا، جیسے یہی زندگی ہے اور عمریوں ہی کھڑے کھڑے بیت جائے گی۔

مگر آخر کب تک؟ یہ سب کچھ بے حد خوبصورت ہونے کے باوجود، گھر میں مسلسل بند رہتے رہتے میں اکتا گئی تھی اور اب میرا خیال بدلنے لگا تھا۔ کب ختم ہوگی یہ سردی؟ کب اتریں گے یہ دستانے؟ کب آزاد ہوں گے میرے ہاتھ؟ میں دن رات یہی سوچا کرتی۔

خدا معلوم کتنا عرصہ یوں ہی گذر گیا اور میں جب اس موسم کی تقریباً عادی سی ہو چلی تھی کہ موسم نے کروٹ بدلی۔ پہلی بار درجہ حرارت سے منفی کا خانہ غائب ہو گیا۔ اور یہاں کا موسم گرما آ گیا۔ پہلے ہی ویک اینڈ پر اریب نے نیاگرہ آبشار دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔

میں نے دنیا کا سب سے بڑا دیوہیکل آبشار پہلی بار دیکھا تو سردی کے بخشے ہوئے سارے دکھ پانی کی چوڑی چادر کے بہاؤ کی زوردار آواز میں یوں گم ہو گئے جیسے سردیاں وہاں کبھی آئی نہ ہوں اور میں نے دستانے کبھی پہنے ہی نہ ہوں۔

اس خوبصورت، پرکشش، دل میں اتر جانے والے منظر کو دیکھ کر یہی جی چاہتا تھا کہ تمام عمر اسی ریلنگ کے سہارے کھڑے کھڑے پانی کے اس بہاؤ کو اپنے اندر اتارتے ہوئے گذار دوں۔ وقت کا بہتا جھرنا بھی تھم جائے اور کبھی شام نہ ہو۔

مقامی جوڑے یہ منظر دیکھ کر بے قابو ہو گئے تھے اور ہمارے یہاں کے بزرگ وزدیدہ نگاہوں سے انھیں دیکھنے کے ساتھ ساتھ لاحول پڑھنا بھی ضروری سمجھ رہے تھے۔

اس آبشار کے نظارے کی جتنی صورتیں تھیں، ہم ان تمام سے محظوظ

ہوئے۔ پھر جانے کب شام بیتی، جب سورج ایک بڑے سے تھال کی شکل میں پانی میں اترنے لگا۔ اجالا دھیمے دھیمے سرمئی ہونے لگا۔ رات آنے کا احساس اچانک اس وقت ہوا جب پانی کی چوڑی چادر سفید کے بجائے دھنک رنگ اختیار کرنے لگی۔ طرح طرح کی روشنائیاں مختلف رنگ لئے پانی پر پھینکی جانے لگیں۔ میں جو پانی کے ہر منظر کی دیوانی ہوں بالکل ہی بے اختیار ہوگئی اور مچل گئی کہ وہیں پر بستر بوریا بچھایا جائے۔ اریب نے بڑی دقتوں سے اور بار بار میرا بازو کھینچ کر مجھے واپس چلنے کے لئے رضامند کیا۔

ہم پارکنگ کی جانب جارہے تھے کہ اچانک میری نگاہ سونیا پر پڑی جو برا سامنہ بنائے، مرے مرے قدموں سے، کسی کی جانب دیکھے بنا، بے تاثر چہرے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ میں جلدی سے اس کی جانب بڑھی۔

'ہائی سونیا'۔

''ہیلو۔'' بڑا ٹھنڈا لہجہ تھا اس کا۔ میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں اکیلی کیا کررہی ہو؟ تم تو کہیں بھی اکیلی نہیں جاتیں۔ اکیلی، وہ بھی یہاں؟ بقول تمھارے اس شہر کی سب سے رومانٹک جگہ پر؟'' میں نے مسکراتے ہوئے ایک اک فقرے پر زور دیا۔

''گولی مارو۔''

''کیوں؟'' میں بات سمجھ گئی تھی لیکن جان بوجھ کر انجان بن کر میں نے پوچھا۔

''میں... اکیلی آئی نہیں تھی... اب اکیلی ہوگئی ہوں۔'' اس نے کہا اور برا سامنہ بنالیا۔ پھر ناک سکوڑ کر بولی۔

''ساتھ تھا وہ میرے۔ مگر اچانک اس بیوقوف کو کچھ رشتے دار نظر آگئے اور ان پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم اجنبی بن گیا۔ دھوکے باز کہیں کا۔ ڈرپوک۔''

بات ختم کرکے اس نے اپنے بوائے فرینڈ توصیف کو انگریزی میں ہی دو چار صلواتیں بھی سنائیں۔

''مگر آخر ہوا کیا؟'' میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور پھر... جیسے اچانک وہ اپنا غصہ بھول گئی۔

''واؤ نائس! تمھارے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں! اور تم انھیں دستانوں میں چھپا کر رکھتی ہو احمق کہیں کی۔''

میں دل ہی دل میں خوش ہوکر بولی۔

''ہاں۔ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اچھا اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم پہ کیا بیتی جو یہ شکل بنا رکھی ہے۔''

یار کیا بتاؤں۔ ہم دیسیوں کا، خاص طور سے تم پاکستانیوں کا کوئی دھرم نہیں ہے۔''

''اے خبردار، جو ایسی باتیں کیں۔ اس میں دھرم کا کیا قصور؟ دھرم کا دعویٰ رکھنے والے منافق اور بے ایمان ہیں، وہ اور بات ہے۔''

''چلو یہی سہی، مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ اچھا بھلا میری کمر میں ہاتھ ڈالے گھوم رہا تھا۔ اچانک کچھ رشتے دار نظر آگئے، بس سٹپٹا گیا۔ بولا۔ جلدی سے الگ ہوجاؤ یہ لوگ میرے والدین کو 'خصوصی' رپورٹ دے دیں گے اور میری شامت آجائے گی۔ خرچہ پانی بند ہوجائے گا میرا... stupid کہیں کا۔ ابھی یہاں میرے ساتھ پیار کررہا تھا۔ اب ابا کو دکھانے کے لئے گھر جاکر ٹوپی لگا کر جاے نماز پر کھڑا ہوجائے گا۔ ریاکار، فراڈ کہیں کا سالا۔''

''آئی اسی کے ساتھ تھیں؟'' میں نے سب کچھ نظر انداز کرکے پوچھا۔

''ظاہر ہے یار! اور کیسے آئی ہوں گی؟ عجیب احمقانہ سوال ہے تمھارا۔''

وہ بہت ہی بیزار اور چڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''اوکے، اوکے! خفا مت ہو۔ بس یہ بتاؤ کہ اب جاؤ گی کیسے؟''

ایک دم میری نظر اریب پر پڑی جنھیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں محسوس ہورہی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر واپسی کے موڈ میں تھے۔ پھر بھی چونکہ وہ نہ صرف میری دوست تھی بلکہ ہماری ہی بلڈنگ میں رہتی تھی، اس لئے میں نے پھر پوچھا۔

''بولو نہ، کیسے جاؤ گی اب؟''

''کہہ تو گیا ہے کہ میرا انتظار کرو۔ ان لوگوں کو سلام کرکے پھر غچہ دے کر آتا ہوں۔ مگر میں اب اس کے ساتھ واپس نہ جاؤں گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔''

''اچھا تو تم ہمارے ساتھ چلو۔'' اریب نے پیش کش کردی، شاید اس خیال سے کہ معاملہ جلد نمٹ جائے۔

اس نے صرف چند لمحے سوچا پھر بولی، ''اوکے... چلتی ہوں۔ تھینکس۔''

اس رات خواب گاہ میں آبشاروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ پوری رات وہ آبشار اپنے بھرپور گونج دار آہنگ کے ساتھ میرے کمرے میں رہے، پورے حسن و جمال اور ٹھنڈک کے ساتھ۔ بس وہی دن تھا جب میں نے فیصلہ کرلیا کہ پوری گرمی ہر سنیچر کا دن یہاں گذارا کریں گے۔

ابتدا میں جب ہم باہر نکلتے تو اریب بہت چوکنے رہا کرتے تھے کہ کوئی ان کی بیوی کو تاک تو نہیں رہا ہے یا کچھ اور حرکت تو نہیں کررہا ہے؟ لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد شاید انھیں اطمینان ہوگیا کہ میرے جملہ حقوق ان کے نام ہی محفوظ ہیں۔ میری طرح شاید انھیں بھی اس ملک کی یہ بات پسند آئی تھی کہ یہاں کوئی کسی کے ذاتی معاملات سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ جو جی چاہے کرو۔ جیسا چاہو پہنو... جہاں مرضی ہو محفوظ اور مطمئن آؤ جاؤ۔ اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ اکیلے بھی جاسکتے ہیں۔ جس کا کم از کم مجھے تو اپنے یہاں ہمیشہ ارمان ہی رہا۔

اریب کے اطمینان کے بعد میں ایک قریبی اسکول جانے لگی جہاں نئے آنے والوں یعنی immigrants کے لئے کئی طرح کے دلچسپ کورس پڑھائے جاتے تھے۔ میں نے ایک کورس میں داخلہ لے لیا اور جب اریب دفتر چلے جاتے تو میں بھی اپنے اسکول کے لئے روانہ ہوجاتی۔

اس روز چھٹی کے بعد حسب معمول راستے میں البرٹ جان (Albert John) مل گیا۔ وہ اپنے پوتے اور پوتی کو اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا تھا اور تقریباً روز ہی اس سے ہائی، ہلو ہوجاتی تھی۔ کچھ تو ضعیفی، اور کچھ گٹھیا کے سبب وہ چھڑی کی مدد سے چلتا تھا۔ مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا کہ اس ضعیفی میں وہ یہ زحمت اٹھاتا ہے۔ میں نے کئی بار یہ پیش کش کی کہ میں یہ کام کرسکتی ہوں کیوں کہ ہم دونوں کے آنے اور جانے کے اوقات یکساں تھے۔ مگر وہ ہر بار میری درخواست بڑی خندہ پیشانی سے رد کردیتا۔ باتوں باتوں میں اس بات کا علم تو ہو ہی چکا تھا کہ اس کا بیٹا بہو دونوں کام کرتے ہیں اور علی الصبح ہی گھر سے نکل جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کام کی ذمہ داری البرٹ پر تھی۔ البرٹ نے پوچھا۔ ''ویک اینڈ کیسا گذرا؟''

میں نے بتایا کہ ہم آبشار پر گئے تھے اور پھر میں نے کل کا سارا احوال اسے بڑے جوش سے کہہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جوانی کا ہر اتوار وہیں گذرتا تھا۔ پھر بہت دیر تک ہم قدرت کے اس شاہکار پر ہی گفتگو اور تبصرہ کرتے رہے۔

البرٹ بھی ہماری بلڈنگ میں، بلکہ اسی منزل پر رہتا تھا جس پر ہم تھے۔ اس لئے اس سے روز ہی، کبھی لفٹ، کبھی عمارت کے اندرونی فٹ پاتھ اور کبھی گھر کے سامنے پارک میں اس سے ملاقات ہوجاتی۔ اس لئے باتیں کرتے وقت میں بہت مطمئن رہتی تھی کہ وہ میری باتیں کسی سے بتائے گا نہیں، البتہ سونیا سے بات کرتے وقت تھوڑا احتیاط رہنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی طرف کی تھی نہ۔ میں ڈرتی کہ وہ ضرور میرے دل کی بات مسز فاروق سے جاکر کہہ دے گی اور پھر وہ مجھے اپنی بنائی ہوئی شریعت کی ترازو میں تولنے بیٹھ جائیں گی۔ مسز فاروق سے ملاقات بھی ایک دلچسپ حادثہ تھی۔

میں یوں ہی ایک روز کہیں جارہی تھی کہ مخالف سمت سے ایک قدرے فربہ جسم خاتون تیز تیز آتی نظر آئیں۔ پینٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس، سر پر اسکارف۔ میں نے بھی اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھ لیا۔ نزدیک آنے پر انھوں نے ''ہیلو'' کہا۔ میں نے بھی ''ہائی'' کردی۔ ہم رک کر بات کرنے لگے۔ وہ جاگنگ (jogging) کے لئے نکلی تھیں اور مجھے پاس کی سہولتی دکان (convenience store) سے ڈبل روٹی لینی تھی۔ وہ گھوم کر میرے رخ پر چل پڑیں۔ مجھے ان کی شخصیت اچھی لگی کہ جب سے یہاں آئی تھی بیشتر گورے اور روکھے چہرے ہی دیکھ رہی تھی۔ آج جو یہ سانولا، نمکین اور اپنا اپنا سا چہرہ نظر آیا تو عمر میں فرق کے باوجود دل ان کی جانب کھنچنے لگا اور دوستی بڑھانے کی نیت سے میں نے ان سے باتیں شروع کردیں۔

''حیرت ہے، یہاں تمھیں اپنی طرف کے لوگ کم نظر آئے؟ یہاں تو بہت بڑی کمیونٹی ہے ہماری۔''

''اچھا؟ کس طرف؟''

''اسی صوبے میں۔ خاص طور سے مسی ساگا (Mississauge) میں، جہاں ہم ہیں۔ یہاں تو بہت پاکستانی ہندوستانی آباد ہیں۔''

''واقعی؟ یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے۔''

''ہاں، اور اب تو یہاں دیندار اور شریعت پر عمل کرنے والے بھی لوگ بہت آگئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا اسکارف برابر کیا۔ ہاتھ اوپر کرنے سے ٹی شرٹ قدرے اوپر اٹھ گئی، جس سے ان کی سانولی سلونی کمر کا کچھ حصہ نکل گیا تھا۔ میں مسکرادی۔ انھیں شاید اس کا احساس نہ تھا، یا ہوا تھا تو پروانہ کی، وہ کہتی رہیں۔

''کوئی شرعی مسئلہ ہوجائے تو فیصلہ بھی وہی سناتے ہیں۔''

''فیصلہ، سناتے ہیں؟ یعنی یہاں بھی جرگہ قائم کرلیا ہے؟'' میرے اندر کا کانٹا سا کھٹکا۔

''میں سمجھی نہیں، جرگہ کیا مطلب؟'' ان کا چہرہ سپاٹ ہوگیا۔ نئی نئی دوستی تھی اور میں دوستی کو قائم رکھنے کی خواہش مند بھی تھی لہٰذا میں نے بات بدل دی اور اپنی بلڈنگ اور اپارٹمنٹ کا نمبر بتاتے ہوئے بولی۔

''کبھی آیئے نہ میرے گھر۔''

''ہاں تم بھی آنا۔'' انھوں نے خوش دلی سے کہا۔ غالباً انھیں بھی میرا دم غنیمت لگ رہا تھا۔ ''تمھاری بلڈنگ کے سامنے جو ٹاؤن ہاؤسز ہیں نہ! انھی میں سے ایک میں رہتی ہوں میں ۱۹۴ نمبر میں۔''

''اوہو، پھر تو بہت قریب ہیں آپ۔ ضرور آؤں گی۔''

''آپ نہیں، تم۔''

میں کھل کر ہنسی۔ ''تم بھی آنا''

پھر ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور اپنے اپنے راستے پر چل دیئے۔ کچھ دنوں بعد میں نے ان کو سونیا سے بھی ملوادیا۔

وہ جو کوئی 'سچا' شاعر کہہ گیا ہے کہ چاردن کی چاندنی... پھر اندھیری رات ہے۔ وہ شاید ہمارے لئے ہی کہہ گیا تھا۔ ابھی میں گرمی کی چاندنی کے اس موسم سے جی بھر کے لطف اندوز بھی نہ ہوئی تھی کہ دوبارہ ہلکی ہلکی سردی شروع ہوگئی اور پھر اسی اندھیری رات کا راج تھا۔

ایک بار پھر برف باری، برفانی طوفان اور برفیلی بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے اریب سے صاف کہہ دیا کہ میں اس موسم میں ہرگز اسکول نہ جاؤں گی۔

''ارے پاگل ہو گیا؟ ایک مہینے کی بات رہ گئی ہے، اس کے بعد تمھیں سرٹیفکیٹ مل جائے گا جو آئندہ کام آسکتا ہے۔ کچھ نہیں بگاڑتی یہ برف۔ دیکھو ہر کام معمول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ تم کل ہی جاکر اچھے snow boots خرید لو۔''

میں مان گئی۔ میں اس لئے بھی مان گئی کہ گھر میں اکیلے پڑے رہنے سے پھر وہی بوریت شروع ہوجائے گی۔ مجھے اپنا word perfect کا کورس بہت دلچسپ اور معلوماتی لگ رہا تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اگلے ہی ہفتے کی بات ہے۔ رات بھر کی برف باری کے بعد میں نے صبح اٹھ کر جو نظارہ دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ مسی ساگا کے تمام لوگ آج صرف برف

صاف کریں گے۔ تمام گھروں میں بسنے والے اپنے اپنے گھروں کے سامنے سے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق، یعنی کوئی پھاوڑے سے اور کوئی بجلی کے موٹر کی مدد سے، جی جان سے صرف اسی کام میں لگا ہوا تھا کہ دروازے کے سامنے اور راہداری سے پرت ہٹائی جائے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں اپارٹمنٹ میں ہوں اور ہمارے یہاں یہ ذمہ داری انتظامیہ کی ہوتی ہے۔

کافی کا مگ ہاتھ میں لینے سے قبل، میں نے اپنا سب سے ناپسندیدہ کام یعنی دستانے پہنے۔ آج میں نے چرمی دستانوں کو ترجیح دی۔ ان میں دو خوبیاں اضافی تھیں، ایک تو یہ کہ وہ گرم زیادہ محسوس ہوتے تھے، دوسرے ہاتھوں پر بالکل فٹ آجاتے تھے۔ اس طرح کافی کا مگ تھامنا میرے لئے آسان ہو جاتا تھا جو اسکول جاتے وقت ہمیشہ ہی میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہی، البرٹ بھی لفٹ کی جانب جاتا ہوا نظر آیا حسب معمول چھڑی اور بچوں کے ساتھ۔ ہیلو، ہائی کے بعد دونوں نے موسم کا رونا رویا۔ یہاں کے کچھ مقامی لوگ بھی بچپن سے برف دیکھتے رہنے کے باوجود اس موسم میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باہر آکر ہم لوگ فٹ پاتھ پر چلنے لگے جہاں کی برف صاف نہیں کی گئی تھی۔ میں نے (اپنی زبان میں) پھونک پھونک کر قدم رکھنا شروع کیا کہ اگر ذرا بھی غلط قدم پڑا تو پاؤں پھسلنے کے سو فی صد امکانات ہوتے ہیں اور اس چوٹ میں کسی بھی ہڈی کا چٹک جانا یا ٹوٹ جانا عین ممکن ہے۔ کیوں کہ جمنے کے بعد برف بھربھری نہیں رہتی، سخت ہو کر شیشے کی مانند ہو جاتی ہے۔

چھٹی کے وقت ایک بار پھر البرٹ کا سامنا ہوا۔ تھوڑے فاصلے پر وہ مجھے اسکول کی جانب جاتا ہوا نظر آیا۔ ان چار گھنٹوں میں مزید برف باری ہو چکی تھی اور اس کے پاؤں بار بار برف میں دھنس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ اچانک ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور دھڑام سے گرنے کے ساتھ ہی تھوڑا سا آگے پھسل بھی گیا۔ دو چار لوگ جو وہاں سے گذر رہے تھے، انھوں نے اپنا چلنا یوں جاری رکھا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اس کا ایک پاؤں پورا برف میں دھنسا ہوا تھا اور وہ اسے نکالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور اسے سہارا دے کر بمشکل کھڑا کیا۔ چند قدم یوں ہی میرا ہاتھ پکڑے پکڑے چلتے رہنے کے بعد اس نے تشکر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''تھینکس سارہ! اگر تم نہ آتیں تو میں ابھی جانے کب تک یوں ہی پڑا رہتا۔''

میں ابھی کچھ کہتی کہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کوئی گاڑی ہمارے نزدیک آکر رک گئی۔

''ہائے! کیا ہوا سارہ؟''

یہ سونیا تھی اور اس کے ساتھ کی سیٹ پر مسز فاروق۔ دونوں پریشانی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

''مسٹر البرٹ پھسل کر گر گئے۔'' میں نے کہا۔

سونیا پریشانی سے بولی۔ ''اوہ! ان کو جلدی سے پچھلی سیٹ پر بٹھا دو۔ گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔'' البرٹ نے جواب دیا۔

"No way" سونیا نے کہا اور گاڑی سے باہر آگئی۔ ''آپ تکلف کر رہے ہیں، جو قطعاً یہاں کا رواج نہیں۔ ویسے بھی ہم کافی پینے کے موڈ میں تھے اور سارہ ہی کی طرف جا رہے تھے۔ کمال ہے... آپ تو، چلئے چلئے۔''

پھر دوسری جانب سے اس نے بھی انھیں سہارا دیا۔ وہ پریشانی سے بولے۔ ''بچے نکلنے والے ہیں باہر۔ ان کو بھی تو لینا ہے۔''

''آپ گاڑی میں تو بیٹھیں۔ بچوں کو سارہ لے کر آتی ہے۔''

انھیں ان کے گھر اتار کر اور بچوں کو کچھ کھانا دے کر میں ان دونوں کے ہمراہ اپنے گھر آگئی۔ کچھ دیر تک ہماری گفتگو کا موضوع البرٹ اور اس کا گرنا ہی رہا۔

''اچھا کافی تو پلاؤ۔'' سونیا نے کہا۔

''بے شک۔'' میں نے کہا اور کچھ دیر بعد کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے سونیا نے کہا۔

''یہ گوریاں، سالی کیسی ریڑ لگاتی ہیں یہاں، اپنے in laws کی۔ بے چارے کو ساتھ رکھا ہے تو اب اس کی اتنی سخت ڈیوٹی بھی لگا رکھی ہے۔ شہزادی نے، ہونہہ۔''

''یہ نہ کہو سونیا۔ ہمارے پاکستان اور تمھارے ہندوستان میں بھی تو اب یہی سب ہو رہا ہے کہ نہیں؟ گیا وہ پرانا دور...''

مگر وہ اپنی ہی کہے گئی۔ ''ارے بچ گیا بڈھا۔ بچا لیا تو نے ورنہ ہڈی وڈی ٹوٹ جاتی آج اس کی، یا پھر سردی سے مر گیا ہوتا۔''

''واہ یہ بات ہوئی۔ میرا پڑوسی ہونے کے ناتے اس کا حق تھا کہ نہیں کہ میں اس کی مدد کروں اور ...''

لیکن ایک بار پھر میری بات کاٹ کر وہ دل کھول کر ہنسی۔

''ارے پاگل! یہ کون سی کتھا لے کر بیٹھ گئی ہے تو اس زمانے میں، حق اور فرض کی۔ مان کیوں نہیں لیتی کہ تو نے ہی اسے بچایا ہے۔ اچھا مسز فاروق آپ بتائیں؟'' اچانک وہ مسز فاروق سے مخاطب ہوگئی اور تائید کی توقع رکھنے والے کے انداز میں ان سے پوچھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مسز فاروق؟''

''ارے! میں تو اس بات کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ سارہ بچ گئی۔''

''سارہ بچ گئی؟'' حیرت کے اظہار کے وقت سونیا کا چہرہ ہمیشہ ہی ہونقوں جیسا ہو جاتا تھا۔

''ہاں بھئی، اب دیکھو نہ سارہ نے نہ صرف اس نامحرم کو چھوا بلکہ سہارا بھی دیا۔ جس کی ہمارے یہاں اجازت نہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ اس نے دستانے پہنے ہوئے تھے اور البرٹ نے بھی۔ نہیں تو اللہ پناہ میں رکھے، کبیرہ...'' ☆☆☆

اس میں صرف ایک مساوات درج کی۔ (اب یہ اور بات ہے کہ ہاکنگ کی کتاب مدتوں تک بالا فروخت (Best Seller) رہی، اور آج بھی مل جاتی ہے)۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آج سے ساٹھ برس پہلے ہماری زبان میں سائنسی بیان و مباحث کی صلاحیت تھی، اور ایسے لوگ تھے، جو اس صلاحیت کو بروے کار لا سکتے تھے، تو یہ آج بھی ممکن ہے۔ شرط صرف محنت، خود اعتمادی، اور زبان اردو سے محبت پیدا کرنے کی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے (اور اردو کے "دوست صاحبان" اسے اکثر اٹھاتے بھی ہیں) کہ اردو میں سائنسی کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اسے پڑھے گا کون؟ یہ سوال صرف غلط مبحث پیدا کرتا ہے۔ پڑھنے والا نہ ہوگا تو کتاب کہاں سے آئے گی، یا کتاب نہ ہوگی تو پڑھنے والا کہاں سے آئے گا؟ یہ وہی پہلے مرغی ہوئی کہ انڈا؟ والا سوال ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پڑھنے والے ہیں (ورنہ "سائنس" دس سال کیا، دس مہینے بھی نہ چلتا، اور "سائنس" کے سوا بھی اردو میں سائنسی رسالے ہیں، مثلاً "سائنس کی دنیا"، جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ دوسری بات یہ کہ کتاب ہوگی تو پڑھنے والے بھی بہم ہو جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ پڑھنے والے نہ بھی ہوں، لیکن زبان تو ہے۔ ممکن ہے کل کو پڑھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زبان کو متمول بنانا کیا ہمارا فرض نہیں ہے؟ محمد حسین آزاد نے سوا سو برس پہلے کہا تھا کہ اردو میں کچھ نہیں، صرف عشقیہ شاعری ہے۔ یہ بات تب بھی غلط تھی اور اب بھی غلط ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو میں سائنسی ادب کے پڑھنے والے نہیں ہیں وہ ایک پرانے جھوٹ کو سچ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان سے برأت کا اظہار کرنا چاہیے۔

ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیے کہ اردو میں سائنسی ادب کی روایت کوئی دو سو برس پرانی ہے۔ دہلی میں دہلی کالج اور ماسٹر رام چندر اور دوسروں نے سائنسی کتب کے تراجم کیے اور خود بھی کتابیں لکھیں۔ اودھ میں ملا عبدالرحیم نے گورکھپور میں، اور پھر کولکتہ میں، مشرق کے کئی دیگر مترجمین نے اعظم گڈھ اور پٹنہ میں، پھر انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد اور دہلی میں، جامعہ عثمانیہ نے حیدر آباد میں، ہمارے سائنسی ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کیے۔ کام کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہی، لیکن کام ہوتا رہا۔ یہ محض بدنصیبی ہے کہ ہم نے خود کو یقین دلا لیا ہے کہ اردو میں سائنسی ادب نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اردو میں نئے علوم کی تمام اصطلاحوں کے متبادل الفاظ نہیں ہیں، اس لئے ہمیں اردو میں سائنس لکھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ایک منٹ رک کر اس بات پر غور کر لیتے ہیں کہ سائنس اور دیگر علوم پر ہمارے لکھنے والوں کو آسانی سے اصطلاحیں کیوں بہم نہیں پہنچتیں؟

(۱) ظاہر ہے کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم کتابیں اور لغات اور فرہنگیں نہیں دیکھتے۔ بہت سے علوم کی فرہنگیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ چاہے بہت اعلیٰ درجے کی نہ ہوں، کامل و اکمل نہ ہوں، لیکن موجود تو ہیں۔ ان سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ پھر کتنی ہی عمومی لغات ہیں، اختصاصی علوم کی رہنما کتابیں ہیں، جن سے ہم اصطلاحات حاصل کر سکتے ہیں، یا ان کی مدد سے اصطلاحات بنا سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی-اردو لغت، کلیم الدین احمد کی انگریزی-اردو لغت، شان الحق حقی کی آکسفورڈ انگریزی-اردو لغت، اور حیم کی انگلیسی-فارسی فرہنگ ہمارے سامنے ہیں۔ کلیم الدین احمد کی لغت تو مہنگی ہے، لیکن بقیہ لغات ہزار روپے کے اندر کی ہیں۔ مولوی صاحب کی لغت تو انجمن ترقی اردو نے چھاپی ہے اور بآسانی مل جائے گی۔ دوسری لغات تھوڑی سی کوشش سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان میں سب اصطلاحیں نہ ملیں گی، اور کوئی ضروری نہیں کہ جو اصطلاحیں ان میں مل جائیں آپ ان سے مطمئن بھی ہو جائیں۔ لیکن رہنمائی کا کام تو یہ لغات بیشک انجام دے سکتے ہیں۔

(۲) دوسری وجہ، اور شاید سب سے بڑی وجہ، یہ ہے کہ ہماری زبان میں اشتقاق لفظ کا اصول نہیں ہے، اور لفظ سے لفظ بنانے کی بھی روایت نے ہمارے یہاں کم فروغ پایا۔ یہ دوسری بات افسوسناک ہے، کیونکہ لفظ سے لفظ بنانے کا رواج پرانی اردو میں بہت تھا، اور غیر رسمی اردو میں اب بھی ایک حد تک ہے، لیکن تحریری اردو میں اب بہت کم ہے۔

اشتقاق لفظ کے اصول سے میری مراد یہ ہے کہ ہر لفظ کی ایک "اصل"، یعنی Root ہو، اور اس "اصل" سے بہت سے لفظ نکلتے ہوں، جیسے کہ جڑ سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ (عربی میں "جڑ" کو "اصل" کہتے ہیں۔ Root Word کو عربی میں "مادہ" کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ سہ حرفی ہوتا ہے۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔) عربی مادوں کے بذات خود معنی ہوتے ہیں، اور ان سے جو لفظ بنتے ہیں وہ بھی بامعنی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مادہ ہے: ح-س-ن۔ اس سے کم سے کم حسب ذیل الفاظ بنتے ہیں:

حُسن، بمعنی اچھا/ اچھائی/ نیکی؛ تاے وحدت کے ساتھ حسنۃ؛ جمع حَسَنات؛ واحد مونث، حُسنیٰ؛ جمع حُسنات؛ واحد مذکر، احسنا؛ جمع

حِسان؛ اسم مبالغہ، حَسّان؛ حسن کی تصغیر، حُسین۔

حُسن، بمعنی اچھائی، خوبصورتی؛ اسم صفت، حسین؛ تانیث، حسینۃ؛ جمع مَحاسن؛ اسم تفضیل، احسن۔

اِحسان، بمعنی اچھا/ نیک کام کرنا؛ اسم فاعل اور اسم مفعول، مُحسِن/ مُحسَن؛ جمع مُحسِنین، مُحسَنین/ مُحسِنات/ مُحسَنات۔

تحسین، بمعنی خوبصورت بنانا/ کرنا، وغیرہ؛ اسم فاعل اور اسم مفعول: مُحسِّن، مُحسَّن۔

استحسان، بمعنی اچھا سمجھنا، وغیرہ: اسم فاعل اور اسم مفعول: مستحسِن، مُستحسَن۔

وغیرہ۔ لہٰذا عربی میں قاعدے کے مطابق ہر لفظ سے لفظ نکلتے چلے جاتے ہیں اور قاعدوں کی پابندی کرتے ہوئے ہم عربی میں اور بھی لفظ بنا سکتے ہیں۔ اس کی ایک نہایت معمولی مثال لفظ "حاسب" ہے جسے "کمپیوٹر" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں compute کے لغوی معنی ہیں:

یقین یا عقیدہ جو اس کے دل میں جاگزیں ہے اور وہ زمین جس پر اس کے پاؤں ٹکے ہوئے ہیں، ان کے خلاف وہ کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اس کی وابستگی فن سے ہے لیکن معروضی صورت حال بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ حق و انصاف کے لئے اپنی حکومت سے اختلاف بھی کرسکتا ہے مگر ریاست سے نہیں۔ سارتر کے سلسلے میں ڈیگال کا جملہ ابھی زیادہ دیر کی بات نہیں۔ تھوڑی سی بجلی پیدا کرنے کے لئے بہت بڑی انسانی آبادی کے انخلا، اور حکومتی سرپرستی میں فسادات کے خلاف ارون دھتی رائے کا احتجاج ابھی تازہ واقعہ ہے۔ جب کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ ادب اور سماج ایک دوسرے کا ردعمل ہیں تو دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ سماجی تحرک کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا لیکن ادب اور سماج کا عمل دوطرفہ عمل ہے۔ یہ ان کی مثبت فکر میں ایک اضافہ تھا۔ ورنہ انھوں نے ترقی پسند ادبی فکر کے اصول افادیت کے رد میں کہا تھا کہ کیا کسی پہاڑی چشمے کو دیکھ کر کسی ادیب کو خیال آیا کہ اس سے پن بجلی بھی پیدا کی جاسکتی ہے؟

اب ادب کے بنیادی محرکات پر چند باتیں ہوجائیں۔ پہلے ان کی فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔ خود اظہاری کی خواہش
۲۔ لوگوں میں اور ان کے افعال میں دلچسپی
۳۔ حقیقت کی ایک دنیا (جس میں ہم رہتے ہیں) اور تصور کی دوسری دنیا (جو ہمارے وجود میں ہے) سے دلچسپی
۴۔ ہیئت سے قربت کا احساس بلکہ محبت

ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم جو سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اس پر لوگوں کو اعتبار ہے، اس لئے کہ ادب مصنف کے افکار و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ہم لوگوں (مردوں عورتوں) سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی زندگیوں، ان کی نیتوں، ان کے جذبات، ان کے تعلقات سے ہمیں یک گونہ لگاؤ ہے۔ گویا ادب انسانی زندگی اور عمل کا ڈراما ہے۔ ہمیں شوق ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے اور تصور کیا ہے اس کے بارے میں لوگوں کو بتائیں۔ اور اگر اس میں جمالیاتی تحرک شامل ہو تو ہمیں خاص تسکین ہوتی ہے کہ ہم نے حسن کا اظہار کیا۔ اس طرح آرٹ ایک فارم بن جاتا ہے۔ انسان جسے معاشرتی حیوان بھی کہا گیا ہے اظہار کو تخلیقی قوت کی آمیزش کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت اور تصور کا تناسب کتنا ہو یہ بھی جاننے کی خواہش ادیب کے دل میں ہے وہ ابلاغ کے ذرائع بھی تلاش کرتا ہے کہ اس کے سماجی شعور کا دوسرے لوگوں کو بھی اندازہ ہو۔ پھر ادب کی ہیئتوں سے بھی اس کو دلچسپی ہوتی ہے۔ دوسروں کے افکار، احساسات، تجربات، مشاہدات، تصورات کا حال جان کر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔

ادب کے محرکات پر گفتگو میں ایک مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ ان میں مختلف علوم کی حدیں مدغم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، عمرانیات، معاشیات کے بعض نظریات یہاں صرف ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں پھر بھی فن کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ مثلاً شاعری محض شخصیت کا اظہار نہیں، شخصیت سے گریز کا نام بھی ہے۔ فکشن محض بیان نہیں، تجرید، علامت، استعارہ بھی اس کے اسالیب میں شامل ہیں۔ قرأت کی اہمیت اور مصنف کی عدم موجودگی نے گل کھلا رہی ہے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ادب دراصل فنون کا شعبہ ہے علوم کا نہیں۔ اسے عقلیانے (rationlize) سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

اب ایک دوسرے نکتے کی طرف توجہ کیجئے۔ شاعری اور دیگر اصناف ادب کو اپنی صنفی حیثیت منوانے اور تنقید کو ان کا جزواں عمل ثابت کرنے میں وقت لگا لیکن ایک بار قائم ہوجانے کے بعد اس کو سند بننے میں دیر نہیں لگی۔ ستم دیکھئے کہ ہمارے اعمال کے مقصود کی وضاحت کرنے والے افلاطون نے اپنی ریاست میں شاعری کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی۔ اس نے کہا کہ شاعر ایسی چیز بناتا ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے، جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، اس لئے ضرر رساں ہے۔ لیکن اس کے براہ راست شاگرد ارسطو نے شاعری کے لائحۂ عمل پر پوری کتاب لکھی جس میں اس نے ''نقل'' کی بات کو حقیقت سے دوری کے بجائے نزدیکی کا عمل قرار دیا۔ اس نے نظریۂ جمالیات کو استوار کیا، شاعری کو اعلیٰ فلسفیانہ امر کہا، جذبات کے تنقیہ (کتھارسس) کی بات کی، پلاٹ کا قصہ چھیڑا، کردار کا ذکر کیا اور ادب میں انبساط انگیزی کے پہلو کی نشان دہی کی۔

بہت آگے چل کر، مگر سنہ عیسوی شروع ہونے سے پہلے، فنون لطیفہ پر شاعر اور فلسفی ہورلیس نے فن اور فطرت کے انضمام کو ادب میں شان پیدا کرنے کا سبب بنایا۔ لانجائینس نے ادب میں ترفع کی بات کی۔ اس نے خیال کی عظمت، جذبے کی شدت، صنعتوں کے استعمال، اسلوب کی متانت، اور الفاظ کی منطقی ترتیب کی اہمیت کو واضح کیا۔

یہاں ہم جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ محرک ہے تحریک نہیں۔ اسے انگریزی کے لفظ mobilization سے ترجمہ کیا گیا ہے اور اس کا پہلا حصہ social یا سماجی ہے۔ اب غور کیجئے تو سماجی تحرک بالکل سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے کہ ادبی تحریریں مثلاً شاعری، فکشن، ڈراما وغیرہ میں یہ جوہر ہے کہ وہ معاشرے کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن ادب یہ کام براہ راست نہیں کرسکتا، ہاں سخت گیر سیاسی معاشروں کی بات ار ہے، کہ وہاں ادیب کو حکومت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ مہذب قوموں کی تعریف یہی بیان کی گئی ہے وہ معاشرہ مہذب ہے جہاں ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے متصادم نہ ہو۔

کبھی وہ لمحہ بھی قوموں کی زندگی میں آتا ہے جب تمام افراد قوم کو یک جان ہوکر کہنا بلکہ عملاً بتانا ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں اور اپنی سرحدوں کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ ملکوں کے لئے یہ نازک وقت ہوتا ہے۔ ایسے میں بہت سے انفرادی رویے اور ذاتی مفادات ترک کرنے ہوتے ہیں۔ اس وقت تو بس ایک ہی دھن ہوتی ہے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے جو زمین ہے وہ کھسکنے نہ پائے۔ آج کی صورت حال میں ہم بحیثیت قوم اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ عالمی دہشت گردی کے ہم نہ صرف شکار ہیں بلکہ اس کے خلاف کارروائی میں عملاً تعاون بھی کررہے ہیں۔ اس کے اثرات ہمارے معاشرتی ڈھانچے اور معیشت کے گوشوں پر کیا پڑ رہے ہیں اس سے ہم بخوبی واقف ہیں لیکن ہمارے ادب پر اس کا انعکاس ابھی بہت دور کی بات معلوم ہوتی ہے ☆☆☆☆

نظم

تنویر اعجاز

ہم کو نبھانی نہ آئی
رسم وفا
نہ سہی
اطوار جفا
تم نے بھی کہاں سیکھے؟
جو کچھ بھی کیا تم نے
اچھا ہی کیا ہوگا
انجام کی پروا
ہم کو بھی کہاں تھی
چلو یوں ہی سہی
ہم ہی میں
نہ تھی
ضبط ستم کی عادت
شکوہ ہی کیا
لیکن اپنوں سے کیا
غیروں سے مگر
پردہ ہی رکھا
ہم نے تمھیں رسوا نہ کیا

غزل

اوم پربھاکر

شجر ہے منتظر آئیں پرندے
گلوں کے رنگ و بو لائیں پرندے
دبا کر چونچ میں رنگین کرنیں
ہماری چھت پہ آئیں پرندے
تصور کے میں جب دانے بکھیروں
حسیں لفظوں کے پھنس جائیں پرندے
نظر صیاد کی پڑنے سے پہلے
مرے دل میں اتر جائیں پرندے
کبھی پھل پھول سے شاخوں پہ لٹکیں
کبھی آنچل سے لہرائیں پرندے
بغیچے میں جو آئے شاہزادی
ہوا میں گھل کے اڑ جائیں پرندے
بوقت شام جب سورج کہے تو
پلٹ کر اپنے گھر جائیں پرندے

حنیف نجمی

ٹھکانا ڈھونڈھوں کوئی آسمان سے اونچا
مکان بناؤں کوئی اس مکان سے اونچا

مرا ہر ایک عمل جبر کے حصار میں ہے
پرندہ اڑ نہ سکے آسمان سے اونچا

یہ دشت وہ ہے جہاں شیر خود مچان پہ ہے
بنا مچان کوئی اس مچان سے اونچا

کبھی تو آئے گی اپنے لہو میں طغیانی
کبھی تو ہوگا یہ پانی نشان سے اونچا

سفر تو میرا زمیں پر ہی تھا مگر نجمی
اک آسماں ملا اک آسمان سے اونچا

غضب کی دھند ہے طاری زمیں پر
گماں حاوی ہوا شاید یقیں پر

بپا ہے ہر طرف شور قیامت
کوئی بیٹھا ہے چپ عرش بریں پر

میں سرتاپا اندھیرا ہی اندھیرا
کروں کیا تبصرہ ماہ مبیں پر

بٹا ہوں دین و دنیا میں کچھ ایسا
کہیں پر سر ہے میرا دھڑ کہیں پر

حرم ہو بت کدہ یا قصر شاہی
ہر اک کا ہاتھ اٹھتا ہے ہمیں پر

غزل

منیب

(اسعد بدایونی کی یاد میں)

میں دور ہو گیا یا دور ہو گئی ہر چیز
پر اس سفر میں یہ طے ہے کہ کھو گئی ہر چیز
اک ایک یاد جو آئی تو ابر تر کی طرح
سواد چشم و دل و جاں بھگو گئی ہر چیز
خلائے تیرہ شبی میں قیام ہے اپنا
چراغ صبح جو بجھ جائے تو گئی ہر چیز
بس ایک داغ جدائی نہیں گیا دل سے
وگرنہ موج ملاقات دھو گئی ہر چیز
میں سو رہا تھا تو ہر چیز جیسے جاگتی تھی
میں جاگتا ہوں تو لگتا ہے سو گئی ہر چیز
بکھر رہی ہے سر گردش غبار یہاں
کہ تار غیب میں دنیا پرو گئی ہر چیز
نہ جانے پردۂ ہستی کے اس طرف کیا ہے
کہ آنکھ موند کے دیدار کو گئی ہر چیز

خزاں کی ایک دوپہر

(اسعد بدایونی کی رحلت پر)

سید محمد اشرف

خزاں کی ایک دوپہر
ہوا کے ظلم سہہ کے
خامشی سے ڈھل گئی
رفاقتوں کی شام
دیکھتے ہی دیکھتے
دکھوں کی رات میں بدل گئی
دھوپ کی حدوں کو پار کرنے والی جاں
پیاس کے نواح میں
ڈھونڈتی رہی اماں
موت کے سیاہ سرد ہاتھ نے
شاہراہ زیست پہ دوڑتی کلیلیں کرتی
سانڈنی پچھاڑ دی
طناب خیمہ کھینچ کر اکھاڑ دی
کسی کا خیمہ خواب کا
ہزاروں چاک سے اٹا
نچا نچا، پھٹا پھٹا
یونہی پڑا رہا
رفو کی فکر میں
بدن کی بازی ہار دی
جان سی عزیز شے بھی وار دی

کلیم کاشانی، عہد شاہجہانی کا طور معنی

کلیم کاشانی نے سری نگر کشمیر میں انتقال کیا (۱۶۵۱) اور وہ اسی قبرستان میں دفن ہے جہاں بعد میں غنی کاشمیری آسودہ، خواب ہوئے۔ کلیم کی موت پر غنی نے تاریخ کہی، ع

طور معنی بود روشن از کلیم

کلیم کی زندگی کے آخری ایام بیماری کے باعث تکلیف میں گذرے لیکن دربار شاہجہانی سے اس کی وابستگی، اور پھر ملک الشعرائی میں اس کی شان بڑی تھی۔ جب شاہزادہ خرم نے شہاب الدین محمد شاہجہاں کے نام سے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو بعد چندے اسے سلطان ترکی کا مراسلہ ملا کہ آپ شاہ ہند ہیں، پھر شاہ جہاں لقب کیوں اختیار کیا ہے؟ دنیا میں سات اقالیم ہیں اور آپ صرف ایک کے بادشاہ ہیں۔ اللہ کے نزدیک عبدالرحمٰن، عبداللہ، پسندیدہ ترین نام ہیں۔ ان میں سے کوئی اختیار کیجئے اور لقب "شاہجہاں" ترک کر دیجئے۔

اس خط کا کسی سے کچھ جواب نہ بن پڑ رہا تھا اور یہ فیصلہ ہونے ہی کو تھا کہ لقب "شاہجہاں" ترک کر دیا جائے اور سلطان روم کو مناسب جواب بھیج دیا جائے کہ کلیم کاشانی نے عرض گذرانی کہ "جہاں" اور "ہند" کے اعداد ایک ہی ہیں (۵۹)، لہٰذا شاہ ہند کے لئے لقب "شاہجہاں" پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔ پھر اس نے مطلع پڑھا ۔

ہند و جہاں ز روے عدد چوں برابر است — بر شہ خطاب شاہ جہاں زاں مقرر است

سارا دربار پھڑک اٹھا۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ سلطان روم کو یہی جواب بھجوا دیں اور کلیم کو اشرفیوں میں تلوا دیا۔

ایک بار شاہجہاں کو بخار آ گیا اور صحت میں دیر لگی۔ اس موقعے پر کلیم نے رباعی کہی جو اپنے مضمون کی ندرت اور نکتہ وری کے باعث فارسی ادب کا شاہکار ہے۔ رباعی کا مضمون یہ تھا کہ اہل زمیں نے بادشاہ کی صحت کے لئے اتنی دعائیں بارگاہ خداوندی میں بھیجیں کہ ہجوم بے پایاں اکٹھا ہو گیا اور کسی کو آسمان سے باہر نکلنے کا راستہ نہ رہا۔ یہی باعث ہے کہ حضرت عیسیٰ، [جو اسلامی عقیدے کے اعتبار سے فلک چہارم پر تشریف فرما ہیں] بادشاہ کی مسیحائی کے لئے زمین پر اتر نہ سکے ۔

روزے کہ تن شاہجہاں از تپ تافت — آں نیست کہ عیسیٰ بہ علاجش نشتافت

می رفت دعاے صحتش بسکہ بچرخ — می خواست کہ آید بہ زمیں راہ نہ یافت

● ذکیہ مشہدی اور پرکاش چندر کے خطوط کے سوا ہر خط میں آپ کے مضمون کی تعریف کی گئی تھی اس لئے سب سے پہلے میں نے اسے پڑھا۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے مجھے شدت سے اپنی بے بضاعتی کا احساس بھی ہوا۔ کاش میں "ہنس" کے ایڈیٹر راجندر یادو کا اداریہ بھی پڑھ سکتا۔ بہتر ہوتا کہ آپ ان کا اداریہ بھی چھاپ دیتے۔ مگر آپ تو اتنے جھلائے ہوئے ہیں (اپنے مضمون میں) کہ اس اداریے کو "سننا" بھی آپ نے بڑی مشکل سے گوارا کیا۔ آپ ایسے صاحب علم آدمی کو اتنے غصے میں دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور (معاف کیجئے) افسوس بھی ہوا۔ سچ ہے مذہب کا معاملہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ اسی لئے اکبرالہ آبادی نے کہا تھا۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

ویسے میں نہیں جانتا کہ یادو جی نے براہ راست مذہبی مسائل چھیڑے یا تہذیبی حوالے سے مذہبی باتیں کیں۔ آپ کے مضمون سے "شریعت" کے کچھ متنازعہ نکات کا سراغ مل رہا ہے۔ ایسے مسائل تو مسلمانوں میں بھی زیر بحث آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں کئی فرقے ہیں اور سب کی فقہ قدرے مختلف بھی ہے۔ اسی کے زیر اثر شرعی مسائل میں بھی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

مثالیں بے شمار ہیں۔ ایمانداری سے ہم اپنا جائزہ لیں تو خود شرمندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی۔ ایک بے ضرر تہذیبی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ہماری "مذہبی فہم" کا اندازہ ہوجائے گا اور ان تعصبات کا بھی جو بلاشبہ مضحکہ خیز ہیں اور ہم میں آج بھی موجود ہیں۔ ہم اپنی خواتین کو (ہندوؤں کے لباس) ساڑھی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں مگر خود دھوتی نہیں باندھتے۔ شادیوں میں سہرے کی ہندوستانی روایت قدیم ترین ہے مگر اب گریز کیا جانے لگا ہے (اس میں دیوبندی اور بریلوی اختلافات حارج ہوگئے ہیں)۔ تہذیبی اعتبار سے لباسوں اور رسوم کی قبولیت غیر فطری نہیں ہے اور موسموں کے تہوار بھی مشترکہ طور پر منائے جاسکتے ہیں مگر ہماری تنگ نظری ان میں بھی حائل ہوجاتی ہے۔

آپ نے اپنے جوابی مضمون میں جو تاریخی حوالے دیئے ہیں وہ بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ وہی بات کوئی دوسرا کہے تو ہم ناراض ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے بزرگ بڑے فخر سے یہ بات کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں ہمارے بچے تہذیب سیکھنے طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے تھے۔ اسی حوالے سے یہاں سندھ میں شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) نے ایک بار یہی بات یوں دہرادی کہ اردو تہذیب "طوائفوں کی تہذیب" ہے تو سبھی خفا ہوگئے اور مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا گیا۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے مسائل ہمیشہ سے الجھے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی کے بعد یہاں سندھی کی حق تلفی ہونے لگی، یعنی ایوب خاں کے دور میں جب اسے دفاتر اور مدارس میں ممنوع کردیا گیا تو تمام سندھی اردو کے خلاف ہوگئے اور پھر یہ نفرت بھٹو کے دور حکومت میں اور شدید ہوگئی حتیٰ کہ لسانی فسادات ہوگئے (اس میں اردو بولنے والوں کی بھی غلطیاں شامل ہیں) چنانچہ اردو پاکستان کی "قومی زبان" ہونے کے باوجود آج تک سرکاری اور تعلیمی زبان نہ بن سکی۔

ہندوستان میں کچھ اور بھی مسائل ہیں جو یہاں سے زیادہ شدید ہیں۔ کئی نفرتیں جو نادان "علمائے مذہب" نے صدیوں سے پھیلا رکھی ہیں، ان کا مکمل تدارک آج تک نہ ہوسکا۔ مثلاً قربانی کا مسئلہ اور اس میں "گاؤکشی" کی روایت جو صرف "ہندوستانی" ہے۔ حضرت ابراہیم نے تو "دنبہ" ذبح کیا تھا، اس کی بلا بکرے تک رہتی تو برداشت کرلی جاتی۔ "گائے" کو کس قصور کی سزا دی جانے لگی، جب کہ ہندوستان میں اسے "ماتا" کا درجہ حاصل تھا اور حاصل ہے۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ گائے اور بیل کے اس ملک پر کتنے احسانات ہیں۔ زراعت کے علاوہ پورے ملک کی ٹرانسپورٹ بیل کے کاندھوں پر رہی اور بڑی حد تک آج بھی ہے۔ بیل گائے سے جنم لیتا ہے۔ پھر یہ کسی مذہبی حوالے سے اگر وہ مقدس سمجھ لی گئی تو کیا ہوا۔ ہم تو مکڑی کی خدمت بھی نہیں بھولتے اور اسے مارنے نہیں دیتے۔ علامہ اقبال نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔

قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں کوئی اور کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ اور تفسیر میں مصروف ہوجاتا ہے حالانکہ یہ نہایت نازک اور محتاط ذمہ داری ہے (ماخوذ از "روزگار فقیر" از فقیر وحیدالدین۔)

مفسرین نے بے شمار بدعتیں پھیلائی ہیں اور محمود غزنوی جیسے سونے چاندی کے لالچی حملہ آور لٹیرے کو "بت شکن" کا لقب دے کر اپنا ہیرو بنادیا۔ ایسی کئی نادانیاں، ان نفرتوں کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان میں اہل طریقت نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اہل شریعت نہ دے سکے، انھوں نے تو آپس ہی میں نفرتیں پیدا کردیں۔ تفصیل میں جاؤں گا تو بات طویل ہوجائے گی۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم اکبرالہ آبادی کے طریقہ کار پر عمل کریں۔ آپ بھی اپنے رسالے کو "ادبی" ہی رہنے دیں تو اچھا ہوگا۔ آپ "جدیدیت" کے علمبردار ہیں اور جدیدیت کی جو تعریف آپ کرتے ہیں اس سے اکثر ترقی پسند بھی آپ سے متفق ہونے لگے ہیں کیوں کہ آپ کا رویہ سطحی نہیں ہے۔ لیکن ترقی پسندی بحیثیت ایک طرز فکر "غلط" نہیں ہے۔ اس میں خوبیوں کو اپنانے کے بڑے امکانات ہیں۔ آپ کی کشادہ دلی کا اندازہ اس سے ہوا کہ آپ نے میری "ثلاثیاں" اور غزلوں کے بعض اشعار جوں کے توں شائع کردیئے۔ وہ بہت واضح بھی تھے اور اختلافی بھی۔ ظاہر ہے کہ آپ باشعور نقاد ہیں۔ میر نے تو کھلے الفاظ میں کفر کا اقرار کرلیا تھا مگر آپ نے میر کا مطالعہ بھی نہایت وسعت فکر کے ساتھ کیا ہے۔ میرا شعر تو اسی "گنگا جمنی تہذیب" کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنوبی ایشیا کی پہچان ہے اور ہماری تاریخ کا تقاضا ہے۔ جس نے تصوف اور ویدانت کو یک جان کردیا ہے۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔

ذکیہ مشہدی واحد مراسلہ نگار ہیں جنھوں نے آپ کی مخالفت کی۔ وہ "ہنس" کا مطالعہ باضابطہ کرتی ہیں، اس لئے راجندر یادو کے انداز فکر اور ان کی وسعت نظر سے باخبر ہیں۔ ذکیہ صاحبہ کے نقطۂ نظر سے یادو صاحب "سیکولر" صحافی اور ادیب ہیں۔ ان سے

اختلاف رائے کیا جاسکتا ہے مگر انھیں اپنے دائرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اختلافات پر سنجیدگی سے سوچ کر نہایت محبت کے ساتھ جواب دینا چاہئے۔ یادو صاحب اور ان کے رسالے ''ہنس'' کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ بہر حال آپ جیسے باشعور اور صاحب علم دانشور سے ہمیں یہی توقعات ہیں۔

میں پرکاش چندر کے خیالات سے بھی اتفاق کرتا ہوں، انھوں نے رابن جیفری کے مضمون کی مخالفت کی ہے۔ اگر یہ سلسلہ درست ہے تو ''شب خون'' میں اردو صحافت کا بھی تاریخی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بھی کئی ایسے نازک مقامات آجائیں گے کہ شاید ہمارا قلم ساتھ نہ دے سکے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ادب کو ادب ہی رہنے دیا جائے ورنہ ''شب خون'' بھی ''ترقی پسند ادب'' کا نمائندہ بن جائے گا اور اس پر بھی وہی الزامات عائد ہو جائیں گے جو ترقی پسندوں پر عموماً دھرے جاتے ہیں۔ خدا جانے آپ میرا خط شائع کرنا پسند کریں یا نہیں لیکن آپ ''خود تنقیدی'' یقیناً برداشت کریں گے، اس کا مجھے یقین ہے۔

کچھ ثلاثیاں اضافی طور پر لکھ رہا ہوں، انھیں مراسلے ہی کا حصہ سمجھ کر پڑھ لیں اور اگر مناسب سمجھیں تو شائع بھی کر دیں تا کہ جن حضرات تک نہ پہنچی ہوں ان کے بھی مطالعے میں آجائیں۔ یہ بکھرے ہوئے'' بھٹکے ہوئے خیالات'' ہیں جو ہمارے ذہنوں میں بھی گردش کرتے ہیں۔ اگر ایسی ہی کچھ باتیں دوسروں کی نظر میں بھی آجائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ گفتگو تو ہو سکتی ہے۔ ہم بھی تو ''غیر مسلم عقائد'' پر گفتگو کرتے ہیں، مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ع

مقصود اس سے قطع تعلق نہیں ہمیں

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرار شہر علم
ہم ابن جہل ہی سہی، بوجہل تو نہیں

(امکان)

عالم تھے، باکمال تھے، اہل کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محو خواب تھے

(انکشاف)

ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز
ایماں میں نہ کیوں علم ہو شرط اول
اقرا ہے، نبوت کا بھی حرف آغاز

(حرف اول)

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

(زاویہ نگاہ)

حرف و رنگ و صوت، سب اظہار کے آداب ہیں
ماورائے ذہن، ہر تمثیل، ہر کردار میں
آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب ہیں

(مابعد الطبعیات)

سورج کا یہ انداز گواہی تو نہیں ہے
آئینہ دکھاتا ہے اجالا مجھے پیہم
سایہ مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

(دوسرا زاویہ)

ہر فتح میں نہاں کوئی گہری شکست ہے
معنی سے بے نیاز، یہ لفظوں کا احترام
ہر بت شکن کے دل میں کوئی بت پرست ہے

(غور طلب)

الفاظ کے بت گر ہیں اور معنی کے قاتل لوگ ہیں
سوچتا ہوں میں تو اکثر بول اٹھتی ہے کتاب
صاحبان علم بھی دراصل جاہل لوگ ہیں

(جہل)

کروں انکار یا اقرار لیکن یہ حقیقت ہے
وہ خالق ہی سہی میرا، میں بندہ ہی سہی اس کا
مجھے اس کی ضرورت ہے، اسے میری ضرورت ہے

(ضرورت)

ہم میں وہ شوق عبادت اب کہاں
ہر محلے میں بناتے ہیں مگر
اے خدائے لامکاں، تیرا مکاں

(ذوق تعمیر)

قرآں، خدا، رسول ہے سب کی زبان پر
ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
جیسے لگی ہو نام کی تختی مکان پر

(نمائش)

بشر نے ڈالی ہے کیا عظمت بشر کی طرح
سکھا رہی ہے یہی سنت براہیمی
کہ آدمی نہ ہو قربان، جانور کی طرح

(احترام آدمیت)

خود آگہی نہ جدت فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایت شق القمر ملی

(رویت ہلال)

اہل اسلام میں نہیں طبقات
اور فرما رہے تھے مولانا
اہل ثروت پہ فرض ہے خیرات
(تضاد)

زندگی بھر تو نہیں، ہاں مگر اک وقت نماز
اپنے ایماں کی سر عام نمائش کے لئے
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
(مساوات)

اس دکھ بھرے جہان میں کوئی کہاں رہے
گرجا ہو، گردوارہ ہو، مندر ہو یا حرم
جس کو جہاں سکون ملے، وہ وہاں رہے
(سیکولرزم)

کراچی — حمایت علی شاعر

❁ تازہ ''شب خون'' میں ایک مراسلہ نگار نے فرمایا ہے کہ راجندر یادو کے مضمون کا جواب نہ دینا چاہیئے تھا کہ وہ کوئی ادبی معاملہ نہیں ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں اس مراسلے کو ایک اہم مسئلے پر بحث نہ ہونے دینے کی ایک سستی کوشش سے تعبیر کرتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم ہندوستانی لوگ کبھی کچھ سیکھ کر نہ دیں گے۔ دلی (۱۹۸۴) میں سکھوں کے قتل عام، پنجاب میں ہندوؤں اور گجرات میں مسلمانوں کی ہزارہا اموات سے ثابت ہے کہ ہم نے تقسیم ہند میں لاکھوں جانیں گنوا کر بھی کچھ سیکھا نہیں۔

اسلام کے بارے میں راجندر یادو کے تاثرات کہ یہ کٹر پنتھی کا مذہب ہے، اور انگریزوں کے بارے میں ان کا یہ خیال کہ وہ بڑے نرم دل اور روادار ہیں، کسی پڑھے لکھے شخص کی جگہ کسی ناسمجھ بچے کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے ان کا جواب جس متانت اور ضبط کے ساتھ دیا ہے وہ اردو تہذیب و تربیت کی بدولت ہے۔ راجندر یادو کو چاہیئے کہ لفظ ''تربیت'' کے معنی سمجھیں کہ اس کا اطلاق ہندوستانی تہذیب پر کس طرح ہوتا ہے۔ اور وہ یہ بھی یاد رکھیں کہ انگلستان کی ملکہ نے، جب وہ ہندوستان کے دورے پر تھیں، جلیان والا باغ کے قتل عام کے لئے معافی مانگنے سے انکار کر دیا تھا۔ راجندر یادو کے ''نرم دل اور روادار'' انگریز صاحبان تو ۱۸۵۷ کے مجاہدین آزادی کو اب بھی ''باغی'' (Mutineer) کے نام سے پکارتے ہیں اور ہم انھیں شہید کہتے ہیں۔

میں یہاں فلسطین کا مسئلہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اسرائیلیوں نے نازی جرمنی سے ظلم و جبر کی تعلیم خوب حاصل کی ہے۔ ان کے کارناموں پر انسانیت کی روح لرز اٹھتی ہے۔ انھوں نے ہر وہ کام کیا ہے جسے اقوام متحدہ کے چارٹر میں انسانیت کے خلاف ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر ہم خط تقسیم کہاں کھینچیں؟ کون مذہبی جنون میں مبتلا ہے؟ ان سوالوں کے جواب آج کے سیاسی پروپگنڈے کی زبان نہیں بلکہ علم کی روشنی چاہتے ہیں۔

اب دوسرے مشمولات کی بات کرتے ہیں۔ میں رام مدنا صاحب کی رائے سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی رائے کے برخلاف، منیب الرحمن کی نظمیں مجھے بہت اچھی لگیں اور مجھے وہ ٹالسٹائی کے بیان کردہ اصول فن کی عملی شکل معلوم ہوئیں۔ ہاں ان نظموں کا اسلوب منیب الرحمن کے عام اسلوب سے کچھ ہٹا ہوا ضرور ہے۔ عرفان ستار کی غزلوں نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں نے انھیں بار بار پڑھا لیکن سیری نہ ہوئی۔ انھوں نے بعض قافیوں اور ردیفوں کو بہت تخلیقی طور پر استعمال کیا ہے۔ حمایت علی شاعر نے حسب معمول مجھے مسرت اور تحیر میں مبتلا کیا۔ بیدار بخت کی نظمیں ایک خاموش دھماکے کی طرح دل کو بیچین کر گئیں۔

آٹووا، کناڈا — امنگ بالی

❁ محترمہ ذکیہ مشہدی صاحبہ نے خدا لگتی بات کہی ہے۔ باقی لوگ آپ کی مدح سرائی کرتے رہ گئے۔ میں خود بھی ''ہنس'' کا پرانا قاری ہوں۔ یہ پرچہ سیکولرزم کا پرزور حامی اور داعی ہے اسی لئے تمام رجعت پسند اور فاشسٹ عناصر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ راجندر یادو کے اداریے بے خوفی، صاف گوئی، سنگھ دشمنی اور ہندو مسلم یکجہتی کے چیختے چلاتے اعلان ہیں۔ ان کے مخالف تمام مراسلہ نگار حضرات وہی ہیں جنھوں نے ''ہنس'' کا صرف نام سنا ہوگا اور جو راجندر یادو کو بھی صرف نام سے ہی جانتے ہوں گے۔ ہمیں ان لوگوں کی قدر کرنی چاہیے جو ہندی کے ایک وسیع حلقے میں مسلسل حق بات کہنے کی جسارت کرتے رہے ہیں۔ اپنے اس متنازعہ اداریے کے شروع میں ہی اگر راجندر یادو اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

رشی کیش — راشد جمال فاروقی

❁ اگست کا ''شب خون'' ملا۔ سرورق مزید خوب صورت ہوگیا ہے اور مندرجات خاصے وقیع ہیں۔ ذکیہ مشہدی کا خط ادارہ ''شب خون'' نے ''حناسرناخن'' کے طور پر شائع کر کے اپنی وسیع القلبی کا مزید ثبوت دیا ہے۔ سیکولر بننے کے چکر میں یہ غلامانہ ذہنیت تو نہیں جو ان سے اس طرح لکھوا گئی؟ شمس الرحمٰن فاروقی نے غلط گوئیوں کا ہمیشہ مقابلہ کیا ہے اور ان کے سر اور دستار پر ہمیشہ ہی وار ہوتے رہے ہیں۔ راجندر یادو کے معاملے میں بھی انھوں نے جو کچھ کہا ہے، حق کہا ہے اور ساری مصلحتوں کو کنارے رکھ کر، ان سے اوپر اٹھ کر ڈنکے کی چوٹ کہا ہے۔ ہزار برس تو کیا دس ہزار برس بھی کوئی ساتھ رہے تو کیا اسے الزام تراشی کا حق مل جاتا ہے؟ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اور general perception کے حوالے سے کوئی رائے قائم کر لینا بے راہ کرتا ہے۔ مسلم معاشرہ کے participant observer تو راجندر یادو کبھی نہیں رہے۔ ان کی انگشت نمائی تو سرے سے عصبیت ہے اور اس میں فاشزم کی بو آتی ہے۔ راجندر یادو کے اصل مضمون کو میں نے پڑھا تھا اور مجھے لگا تھا کہ یہ وہ راجندر یادو نہیں ہیں جنھوں نے گجرات کے فسادات پر مظلوموں کے لئے قلم کا علم اٹھایا تھا۔ اور راجندر یادو یہ cultural policing کب سے کرنے لگے ہیں؟ پتہ نہیں ذکیہ مشہدی کی ترجیحات کیا ہیں، مصلحتیں کیا ہیں؟ موصوفہ کی اس نادان دوستی کو دیکھ کر اور پڑھ کر ''میری زندگی میں افسوس کچھ زیادہ ہی شامل ہوگیا ہے۔'' ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔

پٹنہ — شفیع جاوید

❁ جناب حمایت علی شاعر میرے محترم دوست ہیں لیکن مجھے یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ان کا مکتوب حقائق سے عدم آگاہی کے اظہار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ راجندر

یادو نے مذہب اسلام کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں کہا تھا۔ ان کا روئے سخن مسلمانوں، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب، اور اردو زبان اور رسم الخط کی طرف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے دعوت دی گئی تو میں نے ان کو جواب دینا مناسب اور ضروری سمجھا۔ مذہب سے سروکار فی الحال نہ انھیں ہے اور نہ مجھے۔ اور میں خود کو مذہب اسلام کا مبلغ یا محافظ بھی نہیں سمجھتا۔ راجندر یادو کا جواب دینا اس لئے ضروری تھا اور ہے کہ ان کا لہجہ، استدلال، اور زبان، تینوں ہی اس ذہنیت کی غمازی کر رہے تھے جو اس ملک میں ایک مخصوص سیاسی اور مذہبی فکر سے مختص سمجھی جاتی ہے اور اس ملک کے کروڑوں ہندو مسلمان اس ذہنیت کو مطعون کرتے ہیں۔ میں یہاں تنہا نہیں ہوں۔

بہت سے مسلمانوں میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری ہے۔ حمایت علی شاعر نے ساری اور دھوتی کی عجب دلیل دی ہے جو ان کی عدم واقفیت کا پردہ پھر چاک کرتی ہے۔ مشرقی یوپی سے لے کر بنگال اور آسام تک، اور پھر بنگلہ دیش میں، لاتعداد مسلمان دھوتی پہنتے ہیں۔ ذبیحہ گاؤ کا معاملہ بیچ میں لاکر وہ بات کو اور بھی غیر علمی بنا رہے ہیں۔ پاکستان کا حال میں نہیں جانتا، لیکن اس ملک میں بہت سے لوگ ذبیحہ گاؤ کے مخالف ہیں اور وہ سب ہندو نہیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ ذبیحہ گاؤ کے موافق ہیں، اور ان میں بھی سب مسلمان نہیں ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس (سنی یا شیعی) عالم نے ذبیحہ گاؤ کو اسلام کی شرط ٹھہرایا ہے۔ میں بہت سے پابند شرع مسلمانوں کو جانتا ہوں جو گوشت نہیں کھاتے۔ بہت سے صوفیوں کی درگاہوں کے محاذ میں ذبیحہ گاؤ، بلکہ بعض جگہ تو کسی بھی قسم کے ذبیحے، کی ممانعت ہے۔ اسی طرح، شادی میں سہرے پر پابندی میں نے یہاں نہیں دیکھی، باہر کا حال مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ چھوٹی موٹی باتیں ہیں، ان سے بنیادی مسائل نہ مستنبط کرنا چاہیئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کون سے مسلمان شرفا یا علما وغیرہ کے بچے "تہذیب سیکھنے طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے تھے"، یا کس بزرگ نے یہ بات کہی ہے۔ یہ ضرور سنا گیا ہے کہ ایک زمانے میں کچھ لوگ کہتے تھے اگر علم مجلسی سیکھنا ہے تو طوائفوں سے سیکھو۔ لیکن اس سے یہ مطلب کہاں اور کیوں نکلتا ہے کہ اردو تہذیب "طوائفوں کی تہذیب" ہے، اور یہ مطلب کیسے نکلتا ہے کہ اردو تہذیب مسلمانوں کی تہذیب ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ شیخ ایاز مرحوم نے کس سیاق وسباق میں اپنی بات کہی تھی۔ میں ان کو بہت محترم سمجھتا ہوں، لیکن ان کی ہر بات کو درست نہیں سمجھتا۔ محمود غزنوی کو "بت شکن" کہنا کسی مفسر کی "بدعت" نہیں ہے، اس میں تفسیر قرآن کو کھینچ لانا کہاں کی دانش مندی ہے؟

راہی جعفری کا مضمون جدید ہندوستان میں خواندگی کی حرکیات، خبر اور اخبار رسانی کے مسائل، انگریزی کے بالمقابل ہندی پریس، اور ہماری تہذیب پر سیاسی حالات کی اثراندازی کے بارے میں تھا۔ اگر اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہندی صحافت کے ایک طبقے کو اچھی روشنی میں پیش نہیں کرتیں، تو ان باتوں کی تردید مبنی بر حقائق کی ضرورت ہے، اردو صحافت کو بھی فرقہ وارانہ سیاسی کھیل کھیلنے کا مجرم ٹھہرانے سے یہ مقصد حل نہ ہوگا۔ یہ استدلال تو اندرا گاندھی کا تھا کہ تنہا ہندوستان میں رشوت خوری اور بدعنوانیاں نہیں ہیں، یہ تو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ صحافت، خبر رسانی، خواندگی، یہ تہذیبی اور ادبی مسائل ہیں، انھیں غیر ادبی یا سیاسی مسائل وہی کہہ سکتا ہے جسے سیاست اور ادب کی خبر نہ ہو۔ خاص کر اب تو ایڈورڈ سعید کے بعد ہم یہ کہہ ہی نہیں سکتے کہ جو چیزیں ادب کے "گردوپیش" میں ہیں ان کا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ ویسے میں اپنی معلومات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ آزاد ہندوستان کی اردو صحافت پر فرقہ واریت کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ شاید یہ اپنے اپنے نقطہ نظر کی بات ہے۔

اب رہے جناب راشد جمال فاروقی، تو ان کی سادگی کچھ حمایت علی شاعر سے کم نہیں کہ ان کے خیال میں جن مراسلہ نگاروں نے راجندر یادو سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ ہندی نہیں پڑھتے، یا "ہنس" اور راجندر یادو کے صرف نام سے واقف ہیں۔ راشد جمال فاروقی صاحب اگر مراسلوں کو ذرا توجہ سے پڑھتے تو ایسی بات نہ کہتے۔ یہ بھی پرلطف بات رہی کہ جو راجندر یادو سے اختلاف کرے وہ شمس الرحمن فاروقی کی "مداحی" کر رہا ہے لیکن جو راجندر یادو سے متفق ہو، وہ یادو کا مداح نہیں، بلکہ "خدا لگتی" کہہ رہا ہے۔ سبحان اللہ۔

شمس الرحمن فاروقی
الہ آباد

● جناب شاہد اختر گیا کی تحریر شمارہ ۱۷۲ میں دیکھی۔ میں نے تو نعمان شوق اور عالم خورشید پر محض اپنے تاثرات رقم کئے تھے، مگر جناب شاہد اختر نے ان کی طرفداری میں حد سے تجاوز کیا، تعجب ہے۔ عالم خورشید میرے دوست ہیں اور نعمان شوق بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن ادب میں کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی۔ میں اردو شاعری کا کوئی مفتی یا قاضی نہیں اور نہ کسی مقتدرہ کا امیر ہوں جو "ہندوستان وپاکستان میں کُگرمتے کی طرح اگنے والی شاعری پر...... خامہ فرسائی" کروں۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ شاہد اختر نے نہ کُگرمتا دیکھا ہے اور نہ اس کے بارے میں ان کو کچھ علم ہے۔ پھر یہ کہ عالم خورشید اور نعمان شوق کو جناب شاہد اختر نے "غریب کی جورو" کیوں کر سمجھ لیا؟

راجندر یادو کے مضمون کا جواب فاروقی نے بہت مناسب اور عالمانہ دیا ہے۔ دوسرا کوئی اس قدر برجستہ اور پیاپے نکتہ بہ نکتہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ بس ذرا لہجہ ترش ہوگیا جس کی طرف ذکیہ مشہدی نے اشارہ کیا ہے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ ذکیہ مشہدی کے بارے میں سید سراج الدین کا یہ جملہ چھپا ہے کہ ذکیہ مشہدی کون ہیں؟ سید سراج الدین صاحب جدید افسانے سے کچھ زیادہ شغف شاید نہیں رکھتے۔

جوہر ایاغ
بھاگل پور

● اگست کا شمارہ اس لحاظ سے انوکھا ہے کہ اس میں صرف نثر ہے۔ شاعری کا کوئی نمونہ شروع سے آخر تک نہیں۔ جولائی کے شمارے میں میں نے چھیاسی غزلیں اور چوبیس نظمیں گنی تھیں۔ "کہتی ہے خلق خدا" میں ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ کیا اردو میں صرف شاعری ہوتی ہے؟ بہرحال اس جدت سے میں خوش ہوا حالانکہ میں شاعری کا بچپن سے دلدادہ اور خود بھولے بھٹکے شعر کہنے والا ہوں۔ شعر میرے رگ وپے میں ہے اور اس کی آواز ہمارے گھرانے میں مسلسل گونجتی رہی ہے۔ البتہ اب یہ گھرانہ ان بزرگوں سے خالی ہوگیا ہے، جن کے سینوں میں شعر اور اس کا ارتعاش اس طرح محفوظ تھے جیسے ستار کے تاروں میں سوئے ہوئے نغمے۔ مجھے شعر میں جس کسک، جس ارتعاش کی تلاش رہتی ہے وہ عرصے بعد منیر نیازی کی دو چھوٹی چھوٹی نظموں میں دکھائی دی۔ بڑی سادہ پر کار نظمیں ہیں۔ جب

کوئی شعر یا نظم زندگی کے کسی کونے کو چھو لیتی ہے اور دور تک کوئی منظر کھول دیتی ہے جو کہیں دھندلکے میں پڑا سو رہا تھا تو ایک عجب اہتزاز، اور یہ بھی میرے دل میں تھا، کا احساس ہوتا ہے۔ منیر نیازی کی خصوصاً ''صادقہ'' والی نظم میں بڑی دلکشی اور دور رسی ہے۔

یہ تو خیر کسی پچھلے شمارے کی بات تھی۔ تازہ شمارے میں کئی عمدہ افسانے اور مضامین ہیں لیکن جو خاصے کی چیز ہے وہ حبیب حق صاحب کا ''شریف زادہ'' سیکویل یا تتمہ (؟) ہے، جس کو انھوں نے ''مرد مجاہد، مرد ناتواں'' کا عنوان دیا ہے۔ کیا کردار انھوں نے تخلیق کیا ہے! مجھے گمان بلکہ تقریباً یقین ہے کہ اس کا اوریجنل کہیں نہ کہیں موجود ہے، غالباً نیو یارک ہی میں ورنہ بیانیہ میں وہ سچائی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو مصنف کی فن کاری نے افسانے اور بائیوگرافی کے پیوند سے پیدا کی ہے۔ پھر اس میں جس طرح تاریخ کی رو حجاز، مازندران، رے، بصرہ، اٹک، ملتان، لاہور اور دلی سے ہو کر نیو یارک تک پہنچتی ہے، جو جینئس کے تاریخی سفر کا احساس اور بیان ہے اس میں بڑی کلچرل بصیرت ہے۔ کیا حبیب میاں صاحب اس داستان کو آگے بڑھائیں گے یا پھر چھوڑ دیں گے؟ ابھی تو ان کا دوست اور کہانی کا کردار خدا رکھے زندہ اور سلامت ہے اور شب اور ماہتاب باقی ہیں۔ البتہ حضرت شریف حسن اب مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔

حیدرآباد — سید سراج الدین

● شمارہ ۲۷۱ کی فہرست میں شاعری نہ دیکھ کر کچھ تعجب سا ہوا، اور کچھ مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن حبیب حق کے ''مرد مجاہد مرد ناتواں'' نے چودہ طبق روشن کر دیے۔

مارول — قیوم راز

● ''شب خون'' ۲۷۱ کے افسانے دل کو کھینچتے ہیں، خاص طور پر سید محمد اشرف، نیر مسعود اور حبیب حق کے افسانے۔ ''مردار خور'' سے صاف نظر آ رہا ہے کہ سید محمد اشرف ایک بہت ہی معرکۃ الآرا ناول اردو ادب کو دینے والے ہیں۔ جس سادگی، سچائی اور پختگی کے ساتھ وہ قلم کا استعمال کرتے ہیں ان سے مجھے چیخف کی یاد آ جاتی ہے۔ نیر مسعود ہمیشہ سے میرے، بہت ہی پسندیدہ افسانہ نگار رہے ہیں اور ہر افسانے کے بعد میری تشنگی ان کی تخلیقات کے لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ''پاک ناموں والا پتھر'' ایک معدوم یا بدلتی ہوئی تہذیب کا منظر نامہ ہے۔ میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میں ان کے سلسلے میں ذرا جانب دار ہوں۔ مگر ''مرد مجاہد، مرد ناتوں'' شائع کر کے ایک بار آپ نے پھر ثابت کر دیا ہے کہ آپ سے کسی طور سبقت لے جانا ناممکن ہے۔ اگر چند تکنیکی باتیں نظر انداز کر دی جائیں تو حبیب حق کا یہ افسانہ مابعد جدیدیت کے انداز کا ایک ناولٹ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں مابعد جدیدیت کے کچھ عناصر کار فرما نظر آتے ہیں مثلاً dispersal (جب واقعات کے تانے بانے ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں) antithesis (جس کے لئے مصنف بار بار قاری کو تیار کرتا ہے جب وہ وقت کے chronological order توڑتا ہے) inter-text (کہ تخلیق کو آپ کسی boundary یا حصار میں قید نہیں کرتے) metonymy (اس میں مختلف مقام پر استعاروں سے گریز کرتے ہوئے صنعت بیان میں نئے انداز اپنائے گئے ہیں) اور سب سے بڑھ کر irony جو افسانے کے اختتام تک برقرار ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارے عناصر لاشعوری طور پر خود بخود آ گئے ہیں، ان میں کہیں بھی آورد کا گمان نہیں ہوتا۔ باقی افسانے کچھ زیادہ اچھا تاثر نہیں چھوڑتے۔ انور قمر سے اس سے بہتر افسانے کی امید کی جاتی ہے۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔

کولکتہ — صدیق عالم

● ''شب خون'' اس بار الف سے ے تک پورا ایک نشست میں پڑھ گیا۔ سید محمد اشرف اور نیر مسعود کے افسانے خود کو پڑھوا لینے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ نیر مسعود کے افسانوں کی خوشبو کچھ کچھ ویسی ہی ہوتی ہے جس میں سب کچھ بہت قدیم ہوتا ہے اور اکثر پر اسرار بھی۔ پر اسراریت اس بار سید محمد اشرف کے افسانے میں بھی ہے۔ اس میں بھی گذرے ہوئے ماہ و سال کا عکس زیادہ حاوی ہے۔ حبیب حق صاحب کو پہلی بار افسانہ نویس کے روپ میں دیکھا۔ ان کا افسانہ کئی ایک ادوار پر محیط ہے۔ مگر افسانہ کہیں جا کر دم نہیں لیتا، اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے۔ انھوں نے ''سوار'' والے افسانوں کا اتنا جم کر مطالعہ کیا ہے اور اس کا اتنا اثر ان پر سوار ہے کہ دیکھتے ہی بنتی ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کے افسانے میں جو صورت حال پیدا کی گئی ہے وہ دلچسپ ہے۔ دوسروں کو نصیحت دینے والے خود بھی دودھ کے دھلے نہیں ہوتے۔

اقبال مجید نے نئے لکھنے والوں کو بڑا قیمتی مشورہ دیا ہے۔ مگر نئی نسل اتنی جلدی میں ہے کہ شاید ہی وہ ان باتوں پر کان دھرے۔ قاضی سلیم نے اپنے انٹرویو میں بڑے انکسار اور اتنے اختصار سے کام لیا ہے کہ تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔

راجندر یادو کے سلسلے میں میرا بھی یہی خیال ہے کہ ان کی باتوں کا جواب معتدل لہجے میں بھی دیا جا سکتا تھا۔ بہر حال انھوں نے یہ غلطی ضرور کی کہ جن باتوں کو وہ ٹھیک ڈھنگ سے نہیں جانتے اس پر انھیں فیصلہ کن انداز میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ ابھی میں نے کملیشور کے ناول ''کتنے پاکستان'' کا ترجمہ پڑھا۔ اس میں بھی بڑی بکواس ہے اور شبلی اور اقبال کی خوب چمڑی ادھیڑی گئی ہے۔ خصوصاً اقبال کو تو مغلظات سنائی گئی ہیں۔ تم نے راجندر یادو کو جواب دیتے ہوئے ٹھیک ہی کہا ہے کہ گریب کی جورو سب کی بھوجائی۔

رانچی — پرکاش فکری

● انکم ٹیکس کمشنر ہونے کے باوجود سید محمد اشرف ایسے عمدہ فکشن نگار ہیں، ورطۂ حیرت میں غرق ہونے کا مقام ہے۔ نیر مسعود صاحب حسب معمول حیرت انگیز طور پر چونکانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، افسانہ خوب ہے۔ آپ نے گیڈمر (Gadamer) پر اچھا نوٹ لکھا۔ میں اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن وہ بہر حال عمدہ مفکر تھا۔

کولکتہ — حبیب حق

● شمارہ ۲۷۱ میں بھی محض نثری مواد شامل ہے۔ پتہ نہیں یہ تبدیلی بالارادہ ہے یا اتفاقی ہے۔ بہر حال تبدیلی بذات خود ایک لطف کی چیز ہوتی ہے لہٰذا اسی تبدیلی نے اس شمارہ کو ایک خصوصی شمارہ کی حیثیت دے دی ہے اور اس خالص نثری محفل میں جناب سید محمد اشرف کا ''مردار خور''، جناب نیر مسعود کا ''پاک ناموں والا پتھر'' جناب انور قمر کی ''کشتی''، جناب حبیب حق کا ''مرد مجاہد، مرد ناتواں'' جناب مقصود الٰہی شیخ کا ''دو چار قدم اور''، آنند لہر کا ''تین دن بعد'' سبھی عمدہ افسانے ہیں۔ پڑھنے والوں کا ذوق افسانہ خوانی پوری طرح محظوظ ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ صنف افسانہ کی مطالعہ پذیری دوبارہ لوٹ آئی

ہے۔ اسی شمارہ میں جناب اقبال مجید کا مضمون ''زندانی کے خواب اور جشن انبوہ'' حالانکہ شاعری سے متعلق ہے لیکن نظم اور نثر دونوں سے یکساں مطابقت رکھتا ہے۔

جناب حبیب حق کی تحریر ''مرد مجاہد، مرد ناتواں'' یقیناً دلچسپ ہے لیکن اس کے متعلق سوال یہ ہے کہ اس کو کس زمرے میں رکھا جائے۔ روز نامچہ، سوانح یا خود نوشت سوانح؟ روز نامچہ کے زمرے میں رکھنے میں قباحت یہ ہے کہ کوئی اندراج تاریخی طور پر سلسلہ وار نہیں ہے۔ سوانح کی نوع رکھنے میں پس و پیش یہ ہے کہ بیشتر حصے میں مکالمہ کو بروئے کار لایا گیا ہے جو سوانح کے حسب مزاج نہیں ہے۔ خود نوشت سوانح ہونے کا جہاں تک سوال ہے تو اس کی وضاحت مصنف ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اگر شریف الحسن نقوی مصنف سے الگ شخصیت ہیں تو اس بیانیے کا راوی کون ہے؟

جمیل ظہیر
گیا

❁ انور قمر کا افسانہ ''کشتی'' (سریندر پرکاش کے نام) خوب ہے لیکن افسانے کا اختتام ہمیں متاثر نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ ''کشتی'' کا خاتمہ حسب ذیل ہوتا تو بہتر ہو جاتا کہ ''اس کے دل میں بڑھیا کے بیٹوں کے لوٹ آنے کی امید اب پہلے سے زیادہ مستحکم ہو چکی تھی لیکن......''

ناصر راہی
جمشید پور

❁ کیا جانئے کس عالم میں شمارہ ۲۷۰ کا مطالعہ ہوا کہ احمد مشتاق، لطف الرحمن، عرفان ستار، حسن عباس رضا، اسعد بدایونی اور خواجہ رضی حیدر کی غزلیں براہ راست دل میں اتر گئیں۔ کرشن کمار طور، ظفر گورکھ پوری، سلطان اختر، مدحت الاختر، ابرار احمد، اکرم محمود کے اشعار بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔

زبیر شفائی
کان پور

❁ مجھے حیرت ہے کہ ترقی پسندوں کا سب سے بڑا مخالف عوامی مصنفین کی لایعنی تحریروں اور اشتراکی تخن کا دشمن باوجود مخالفین کی کاوشوں کے آج بھی اپنے مشن میں کامیاب ہے۔ جدیدیت کے بانیوں میں شمس الرحمن فاروقی کی حیثیت راہبر کی سی ہے۔ ''قاضی سلیم سے گفتگو'' اور ''مرد مجاہد، مرد ناتواں'' خوب تر ہیں۔ صفحہ (۶۰)، (۶۹) اور (۲۷) پر رسائل کے نام اور مدیران کے نام کے ساتھ پورے پتے بھی ہوتے تو قارئین کے لئے مفید ہوتا۔ ترقی پسند ادب نے نوجوان نسل کی رہنمائی کی یا اسے بے راہ رو کیا، مذہب سے دوری عطا کی اس پر تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے تا کہ ''شب خون'' کے نئے قاری جو کمیونزم اور اشتراکیت کے زمانے کے بعد ادب سے وابستہ ہوئے، یا جو اردو ادب سے استفادہ کریں وہ ترقی پسندی کے اثرات سے واقف ہو سکیں۔

تسکین کاظمی
حیدر آباد

❁ شمارہ نمبر ۲۷۰ شاعری اور ۲۷۱ نثر نمبر ہے۔ اول الذکر میں ایک سے ایک غزلیں اور نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ نثر میں تمہیدی نوٹ، اخبار و اذکار، سوانحی گوشے اور قاریوں کے خطوط شامل ہیں۔ شمارہ کی پہلی تخلیق بصورت نثر اور آپ کی تحریر کے مطابق نظم نوشتہ، اسد محمد خاں ہے۔ جس کے متعلق ''اس بزم میں'' کے عنوان سے آپ نے لکھا ہے ''یہ نظم ایک محبوب و مقبول معاصر کو خراج عقیدت ہے اور موسیقی کی روح کو الفاظ میں بیان کرنے کی غیر معمولی کوشش بھی۔'' اس کے بعد غزلوں اور نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور آخر تک چلتا رہا ہے۔ ظفر گورکھپوری کی صرف ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ''خیموں میں ان کے آگ لگائی جا سکتی ہے راہل ستم کی نیند اڑائی جا سکتی ہے۔'' آج کل دنیا میں شاید یہی ہو رہا ہے۔

اتنی ساری غزلیں اور نظموں کا جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان سے تھوڑا بہت لطف اندوز میں بھی ہوا اور جو کسک اور کمی باقی رہ گئی تھی اس کی تلافی آپ نے شمارہ نمبر ۲۷۱ میں کر دی۔ سید محمد اشرف سے لے کر آخر تک کے افسانہ نویسوں اور مقالہ نگاروں سبھی نے متاثر کیا۔ محمد اشرف صاحب نے تو ''مردار خور'' میں ایک انوکھا نسوانی کردار بھی پیش کیا ہے۔ اور رشید انصاری صاحب کا انٹرویو مختصر مگر خیال انگیز ہے۔ قاضی سلیم ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں ''جدیدیت کا جب آغاز ہوا تو کئی انتہا پسند شاعروں نے اپنی ذاتی علامات کا جو مبہم اور ناقابل فہم تھیں، استعمال کیا... یہ شاعری ایک معما بن کر رہ گئی۔'' میری ناقص رائے میں یہ روایت تو اب بھی قائم ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس میں بہکاؤ اور بھونڈا پن نہیں ہے۔ اس شمارے کی تمام مشمولات مجھے جان دار اور پر لطف لگیں مگر فرداً فرداً ہر ایک کا ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اقبال مجید کا مقالہ سردار جعفری کے متعلق ایک نئے زاویے سے لکھا گیا ہے اور اچھا ہے لیکن میرے خیال میں وہ نہ جانے کیوں جذباتی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کیسے سمجھ لیا کہ اور لوگ مطالعہ نہیں کرتے؟ ہاں ان کا یہ کارنامہ ضرور ہے کہ جعفری صاحب کے ہمہ گیر مطالعہ اور عمیق نظر کو انھوں نے اس انداز سے غالباً پہلی مرتبہ پیش کیا ہے۔ آپ بہت اچھی روایت یہ قائم کر رہے ہیں کہ ہندی کے متعلق بھی اردو والوں کو روشناس کرا رہے ہیں۔ پریمل پربشن ٹنڈن کا مضمون اور نجم فاروقی کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ اس سے ہندی کے ادبا اور شعرا کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے تمہیدی نوٹ اور سوانحی نوٹ اور قاریوں کے خطوط کے متعلق کیا پوچھنا۔ دونوں شماروں میں بڑے پر مغز ہیں۔ ان کے ذریعہ میرے علم میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد اعظمی
کھمہنا، اعظم گڈھ

❁ ''اس بزم میں'' آپ نے مجھ کو شامل کر کے بھی شامل یوں نہیں کیا کہ میرا نام ''رشید انصاری'' کی جگہ ''رشید الدین'' لکھا گیا ہے۔ نیز یہ کہ میں اب ''منصف'' سے نہیں بلکہ روز نامہ ''عوام'' سے وابستہ ہوں۔ اس اخبار کے پولیٹیکل میگزین سیکشن سے وابستگی ہے اور آزادانہ طور پر سیاسی مضامین (زیادہ) اور ادبی مضامین (کم) مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں شاید آپ کی بھی نظر پڑی ہو۔

رشید انصاری
حیدر آباد

❁ گذشتہ شمارے میں آپ نے ہمارا گوشوارۂ عمل شائع کیا تھا۔ ہم آپ کے ممنون ہیں۔ یہ گوشوارہ جو اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور اس کے حقوق کی بحالی سے تعلق رکھتا ہے، اردو معاشرہ کا ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے ذوق، احساس فرض، ضرورت اور وسائل کے مطابق اس پروگرام کو عملی بنانے میں حصہ لے سکتا ہے۔

اردو چونکہ ہماری مادری زبان ہے اس لئے ہم سب لوگ، تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ، اسے جانتے ہیں اور بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ بھی اردو جاننے والوں میں ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری بہت بڑی تعداد اردو لکھنا

پڑھنا نہیں جانتی۔ اس میں غیر تعلیم یافتہ اور تعلیم یافتہ دونوں شامل ہیں اور اس وجہ سے ہم لوگ اردو کو اپنے بہت سے روزمرہ کے کاموں میں استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھنا کوئی مشکل کام ہے۔ اردو نہ جاننے والوں کے لئے اردو زبان سیکھنا مشکل ہو سکتا ہے، لیکن جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لئے اس کا لکھنا پڑھنا سیکھنا نہایت آسان کام ہے۔ یاد رکھئے ہمیں اردو نہیں سیکھنا ہے۔ اردو ہم جانتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس کا لکھنا پڑھنا سیکھنا ہے۔ اردو کی الف بے تے لکھنے پڑھنے اور ان حروف کو ملا کر لکھنا پڑھنا سیکھنے سے یہ خوبی بہت تھوڑے وقت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ہم ایک ماہ تک ایک گھنٹہ روزانہ اردو کے حروف تہجی اور ان کا ملانا لکھنا پڑھنا سیکھیں تو کافی ہوگا اور اگر تین ماہ تک اس عمل کو جاری رکھا جائے تو اچھی خاصی مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

اردو رسم الخط دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح اردو کے حروف تہجی اس کے اپنے ہیں اور ایک طویل تاریخی عمل کے مرہون منت ہیں۔ جتنی آوازیں (اصوات) اردو میں ہیں شاید دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے اردو بولنے والے دنیا کی کسی بھی زبان کو نسبتاً جلد سیکھ لیتے ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں غیر زبان کا ان کا تلفظ بھی اہل زبان جیسا ہو جاتا ہے۔

اس دور میں اردو بولنے والے معاشرے کے سامنے ایک بہت ہی اہم مسئلہ اپنی زبان، کلچر اور تشخص کے تحفظ کا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ پرائمری تعلیم کو جس حد تک ممکن ہو اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور اس شعبے میں بیشتر عمل خود کریں، دوسروں کی طرف نہ دیکھیں۔ موجودہ حالات میں یہ سب بالکل قابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ زبان اور کلچر کے تحفظ کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ اگر ہم اپنی زبان اور کلچر کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ فطری اور موثر پرائمری تعلیم و تدریس و تربیت صرف مادری زبان کے توسط ہی سے ممکن ہے۔

ہم جس اردو کے تحفظ کی بات کرتے ہیں اسے اس عام بول چال کی زبان کے حوالے سے سمجھنا چاہئے جو گنگا جمنی کلچر کا جز ہے اور جو ایک طویل تاریخی عمل سے گذر کر شمالی اور وسطی ہندوستان کے بڑے علاقوں میں عام بول چال کی زبان بن چکی ہے۔ ہم جس زبان کو ایک عرصے سے ہندوستانی کہتے آئے ہیں وہ ہمارے ملک کے متذکرہ بالا تمام علاقوں کی بول چال کی زبان ہے۔ اردو اسی ہندوستانی بول چال کی معیاری شکل ہے۔ اسی وجہ سے فلمی صنعت کے پہلے دن سے آج تک ہماری فلموں کی مقبول ترین زبان اردو ہی رہی ہے اور اردو فلمیں تمام برصغیر میں اور برصغیر کے باہر بھی جنوبی ایشیا، شرق میانہ اور افریقہ کے کئی ملکوں میں بڑے شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو کے وطن کے بارے میں شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستانی کے سب علاقے اردو کے علاقے ہیں۔ جو علاقے اب ہندی کے کہے جاتے ہیں وہ سب اردو کے ہیں یا اردو کے بھی ہیں۔ اردو نہ کبھی بے گھر تھی نہ ہوئی، نہ ہو سکتی ہے۔ اور اس دور میں تو اپنے گھر کے باہر بھی ساری دنیا میں اردو کے مراکز پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مشرق وسطی، جنوبی ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ، کناڈا ہر جگہ اردو پہنچ رہی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے اور اہم ترین ریڈیو اسٹیشن چوبیس گھنٹے میں کئی بار اردو خبریں، مباحثے اور کلچرل پروگرام نشر کرتے ہیں جن سے "سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے" کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اردو کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اردو کا منبع ومخرج خارجی نہیں بلکہ خود ہمارے عوام ہیں، ہماری زمین اور ہماری تاریخ ہے۔ آنکھیں اگر کھلی ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ دور کتنا ہی پر آشوب کیوں نہ ہو اس کا ایک اطمینان بخش پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو کسی دوسرے کے حقوق زیادہ دیر تک پامال نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی ہمارا حق دبائے رکھ سکتا ہے نہ ہم کسی کا۔ ہم کسی کا حق دبا نہیں رہے۔ ہمارا ضمیر صاف ہے۔ لہٰذا ہمیں پر امید رہنا چاہئے۔

اگر آپ کسی اخبار یا رسالے سے منسلک ہیں تو اپنے موقر جریدے میں تھوڑی سی جگہ عنایت فرما کر اس پروگرام کی مزید اشاعت اور ترویج کر سکتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی رکالج راسکول میں ہیں تو اس پروگرام کو تحریک بنا سکتے ہیں۔ اگر ادیب یا مضمون نگار ہیں تو اپنی تحریروں میں کبھی کبھی اس پروگرام کے عملی پہلو اور اپنی مدد آپ کے اصول کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ اگر کسی مدرسے میں ہیں تو دین کی حقیقی تفہیم اور اس کی روح تک رسائی کے لئے اور اپنے نصاب کے درس و تدریس کو آسان، عام فہم اور موثر بنانے کے لئے اردو کی ناگزیریت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پورے کے پورے پروگرام کو اپنے مدرسے میں عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہیں، خطبہ دیتے ہیں، یا وعظ کرتے ہیں تو بڑی آسانی سے اس پروگرام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں اور ان میں اپنی مادری زبان سے محبت اور وفاداری کے جذبات کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پروگرام کی فوٹو کاپیاں بنوا کر تقسیم کرا سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کچھ بھی کرتے ہوں، جہاں کہیں بھی ہوں، کسی بھی حال میں ہوں، اپنے گرد وپیش میں کم از کم مادری زبان کی پوری شکل وصورت کے تحفظ کا جذبہ تو پیدا کر ہی سکتے ہیں۔

ہمارے دور میں اردو کے حقوق بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ اردو کا استعمال سرکاری اور تعلیمی سطحوں پر یا تو بالکل بند کر دیا گیا ہے یا محدود رکھا جا رہا ہے۔ جب ہم اردو کے ان حقوق کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دراصل ہم اردو معاشرے کے اکثریتی اور اقلیتی دونوں طرح کے علاقوں میں سرکاری اور تعلیمی سطحوں پر اردو کا آزادانہ استعمال چاہتے ہیں۔ یہ وہ حق ہے جو ملک کی دوسری تمام زبانوں کو اس ملک میں حاصل ہے اور جو پہلے ہمیں بھی حاصل تھا اور اب نہیں ہے اور بے انصافی کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال ہماری پیروکاری کے باوجود اس حق کی بحالی میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس جملہ صورت حال کے پیش نظر ہمارے لئے اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ اردو کے حقوق کی بحالی کا بہت گہرا تعلق ان سب باتوں سے ہے جو زیر نظر پروگرام میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھیں تو اس پروگرام کے مقاصد کے حصول سے اردو کے حقوق کی بحالی کا عمل آسان ہو سکتا ہے۔ پہلے وہ کام کریں جو پہلے کرنا چاہئے۔ ہمارے نقطہ نظر سے اپنی عملی حیثیت میں یہ پروگرام بالکل مقامی ہے اس لئے اسے شروع کرنے کے لئے کسی بڑی تیاری یا نقل وحرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جزوی عمل درآمد میں تو کسی تاخیر کی ضرورت ہی نہیں۔

اردو مرکز، ہاپوڑ، ۲۴۵۱۰۱

عزیز احمد

اخبار و انکار

٭ مدھیہ پردیش حکومت کا اقبال سمان اس سال مشہور شاعر، ڈراما و نثر نگار رفعت سروش کو ملا ہے۔ یہ انعام ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے اور ایک سند اعزاز پر مشتمل ہے۔ ہم اس انعام پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

٭ ایڈورڈ سعید (پیدائش ۱۹۳۵) کی موت ایک عالم کو افسردہ کر گئی۔ انھوں نے ادبی تنقید اور ثقافتی تاریخ و فلسفہ میں لازوال نقوش چھوڑے اور فلسطین کے مقصود کے لئے ان کی جدوجہد اور بے خوف جنگ نے انھیں ساری دنیا کے مظلوم اور بے دخل کئے ہوئے لوگوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ایڈورڈ سعید کو ۱۹۴۸ میں اپنا گھر یروشلم چھوڑنا پڑا جب اسرائیلی حکومت نے وہاں کے لوگوں کو بے دخل کر کے ترک وطن پر مجبور کیا۔ قاہرہ اور امریکہ میں تعلیم پانے کے بعد وہ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور بعد میں "یونیورسٹی پروفیسر" کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ انھوں اپنی شہرہ آفاق کتاب Orientalism (مطبوعہ ۱۹۷۸) میں دکھایا کہ "مستشرق" حضرات نے بھی مغربی سامراج کی اتنی ہی خدمت کی ہے جتنی مغربی سیاست دانوں نے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مستشرقین کا علم اور ان کے مطالعات بھی اقتدار قائم کرنے، اقتدار قائم رکھنے، اور مشرق کو مجہول و محکوم بنائے رکھنے کے عمل میں معاون رہے ہیں۔ اس کتاب پر واویلا بہت ہوا لیکن اس نے گذشتہ پچیس سال کی مغربی اور مشرقی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنے مخصوص طرز فکر کو کام میں لاتے ہوئے Beginnings اور The World, The Text, and The Critic اور Culture and Imperialism جیسی کتابوں کے ذریعہ خود کو اس زمانے کے اہم ترین نقادوں میں تسلیم کرایا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت Out of Place میں جلاوطنی، عرب تشخص، اور دہشت گردی کے بارے میں بھی خیالات پیش کئے۔ ایڈرڈ سعید کا بیٹا ودیع بھی ان کی طرح فلسطینی مقصود کے لئے گرم عمل ہے۔ ہم مرنے والے کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

٭ جب سے ہمارے وزیر اعظم محترم کو بعض اردو حلقوں نے شاعر مان لیا ہے اس وقت سے ان کی پارٹی کے دیگر رہنمایان بھی اردو زبان اور شاعری کے نقاد کہلانے کے شوق میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ونے کٹیار صاحب نے اردو کو دہشت پرستوں کی زبان بتایا ہے۔ پتہ نہیں وہ عبرانی کو کیا کہیں گے جس کا بولنے والا ایریل شارون تمام دنیا کی نظروں میں دہشت گرد قرار پا چکا ہے۔ اردو زبان کی اس توہین پر ہم سخت احتجاج کرتے ہیں۔ ایک اور بزرگ رہنما پرمود مہاجن نے فرمایا ہے کہ اقبال کا ہندوستان کے لئے یہ کہنا کہ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا بے معنی ہے، کیونکہ ہماری تہذیب میں تو وطن کو ماں کہا جاتا ہے۔ استعارے سے ان کی بے خبری اور شعری زبان سے ناواقفیت کے اس مظاہرے کا جواب ایک ہندو خاتون نے خوب ہی دیا کہ گلستان اور بلبل میں وہی رشتہ ہے جو دھرتی ماتا اور اس کے بچوں میں ہے۔

اس بزم میں

٭ میرانیس پر یہ گفتگو ۱۲ اگست ۱۹۹۱ کو انوار احمد خاں کے زیر اہتمام لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر تین قسطوں میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ یہ کئی بار نشر ہوئی اور اپنے سلسلے کی مقبول ترین گفتگوؤں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی تیسری قسط نہ مل سکی، لیکن دو قسطوں کی اس ٹیپ کو بنارس کے نوجوان ادیبوں **جاوید انور** اور **عارف ہندی** نے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ ٭ **اوم پربھاکر** ہندی کے سربرآوردہ نقاد اور شاعر ہیں۔ کچھ دن ہوئے وہ گوالیار یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہندی کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے ہیں۔ اردو انھوں نے اس زبان اور اس کی شاعری کی محبت میں سیکھی ہے۔ "شب خون" میں ان کی پہلی آمد ہے۔ ہم ان کا استقبال کرتے ہیں۔ ٭ نامور شاعر اور نقاد **تبسم کاشمیری** کچھ مدت سے ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف "اردو ادب کی تاریخ، ابتدا سے ۱۸۵۷ تک" دور و نزدیک سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ ٭ **رفیق راز** کا تبادلہ کارگل سے سری نگر اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "انہار" جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ ٭ **شفق سوپوری** اپنا پہلا مجموعہ کلام ترتیب دے رہے ہیں۔ ٭ گذشتہ شمارے کا سرورق **عادل منصوری** نے بنایا تھا۔ ہم نے سہواً ان کی جگہ احمد نیاز رزاقی کا نام لکھ دیا تھا۔ ہم اپنے دونوں دوستوں سے اعتذار کرتے ہیں۔ ٭ **شمس الرحمن فاروقی** کی کتاب "لغات روزمرہ" کچھ مہینے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اب اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن ادارہ "آج" نے کراچی سے شائع کر دیا ہے۔ فاروقی کے افسانوں کے مجموعے "سوار" کا ہندوستانی ایڈیشن حال میں شائع ہوا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اور ٭ **شہریار** کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی کورٹ کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی پہلے بھی علی مسلم یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی کورٹ کے رکن رہ چکے ہیں۔ ٭ **محمد اظہار الحق** کا نیا مجموعہ کلام "پانی پر بچھا تخت" ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ **مخمور سعیدی** کا نیا مجموعہ کلام "راستہ اور میں" چند ہفتے ہوئے شائع ہوا ہے۔